

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188531

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 3-122 Accession No. 14785

Author 2-2 محمد شمس

Title دلی کا سفر

This book should be returned on or before the date last marked below.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 2-122 Accession No. 14485

Author 2-122 کی شمع

Title دبی کا سنہالا

This book should be returned on or before the date last marked below.

دلی کاسنیہالا

خواجہ محمد شفیع (دہلوی)

۱۳

مکتبہ جامعہ دہلی

قیمت ۵۰

طبع دوم ایک ہزار
مطبوعہ جید برقی پریس، - دہلی
اکتوبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

پہلے تیس صفحے اور صفحہ اکتالیس آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے
واسطے لکھے گئے اور ان کی اجازت سے شائع ہوئے

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	مرزا فخر و عرف مرزا چاچی	۱۷
۲	مرزا کالے	۲۰
۳	مرزا فیروز شاہ	۲۳
۴	مرزا علی سلطان، مرزا ادیس، مرزا قافور الدین، مرزا جہانگیر، شکاری	۲۴
۵	مرزا چٹیا	۲۴
۶	مرزا مجاہد الدین	۲۵
۷	مرزا محمود شاہ	۲۵
۸	مرزا قادر بخش	۲۶
۹	سرسید، منشی ذکا و اللہ، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا حالی	۲۸
۱۰	حکیم محمود خاں	۳۰
۱۱	نواب شمس الدین خاں والی فیروز پور و لوہارو	۳۲
۱۲	خواجہ امان	۳۰
۱۳	جامع مسجد کاچوک	۳۱

۳۸	مشتری کا مکہ	۱۳
۵۲	ضلع جگت کے استاد	۱۵
۵۶	استاد محمد بیگ کا مکہ	۱۶
۷۸	نواب ضیاء الدین خاں والی لوہارو کی صحبت	۱۷
۷۹	استاد میر جان جزدوس	۱۸
۸۷	بزم مے	۱۹
۹۰	خواجہ امان کی محفل	۲۰
۹۱	قاری فخر الدین	۲۱
۹۲	اکھاڑا	۲۲
۹۳	مرزا علی جان بیگ، حاجی جی جوتے والے، سکھ دیو، صدیق پہلوان	۲۳
۹۷	مرزا عاشور بیگ منجم	۲۴
۹۸	میر کرامت علی خاں شاطر	۲۵
۹۹	میر ماہی پیراک	۲۶
۹۹	مولوی محمد شفیع خاں، مولوی محمد تقی خاں، مفتی صدر الدین، مولوی عطاء اللہ	۲۷
۱۰۲	بدالدین خاں مہر کند	۲۸
۱۰۲	اسد اللہ خاں غائب، منشی ہرگوپال تفتہ	۲۹
۱۰۵	منشی بالکنڈ بے صبر، نواب مسطفیٰ خاں شیفہ، استاد ذوق	۳۰
۱۰۵	محمد حسین آزاد	۳۱
۱۰۶	پنڈت ہر دے ناتھ ستار نواز	۳۲

۱۰۶	خوش نوبیں	میر خجہ کش	۳۳
۱۰۷	ریاضی کے استاد	ماسٹر اچندر۔ فریدالدین خاں	۳۴
۱۰۷	مصور	تفضل حسین خاں	۳۵
۱۰۸	شہسوار	استاد نجو بیگ	۳۶
۱۰۹	شہسوار	استاد جمن صاحب، استاد میاں جان	۳۷
۱۱۰	فارسی کے عالم	مثنیٰ نرائن واس پنواڑی	۳۸
۱۱۱		مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ رفیع الدین،	۳۹
۱۱۱		شاہ اسماعیل شہید	۴۰
۱۱۲	داستان گو	میر کاظم علی خاں	۴۱
۱۱۴		جامع مسجد	۴۲
۱۱۵		بی واریاں صاحب کامکان	۴۳
۱۲۵		بزم سخن	۴۴

نذر

سہارن کی دلی کو

آرزو

دعا خیر

خواجہ محمد شفیع بیاض محل دہلی

دلی کا سنبھالا

تمہارا اٹھ کے جانا تھا مریضِ غم کا مرجانا
مری جاں فرق ہوتا ہے سنبھلنے اور سنبھالنے میں
جو پیدا ہوا اس کو مرنا ہے۔ ہر شے کے لئے فنا بقا ہے بس اس
ذاتِ لایزال کو

ہر آنکھ زاد بنا چار بایدشِ نوشتہ
ز جامِ دہر مے گلِ من علیہا فان
عناصر جدا ہونے سے پہلے ساتھ نہ چھوڑنے کی جان توڑ کوشش
کرتے ہیں اور پھر دم توڑ دیتے ہیں۔ مرنے والے کی اس آخری سعیِ نسیت
کو سنبھالا کہا جاتا ہے۔

قحط الرجال شہر کی موت ہے جب تک گود سپوتوں سے بھری
ہے شہر زندہ ہے۔ گود خالی ہوئی اور وہ ختم۔ نو نہالِ زیرِ نیتِ وہ

چمن نہ رہے، چمن اجڑ گیا۔ شہر مر گیا۔ دلی ایک شہر تھا عالم میں
 انتخاب۔ جب اس کا وقت آیا وہ بھی نہ رہا۔ ہاں ختم ہونے
 سے پہلے اس سرزمین نے ایسے ایسے لال اکھلے اور وہ دکھائے
 سرسبز اگائے جن کا ہر دانہ تاج شاہی کے قابل اور ہر پھول
 درخورد و دستار تھا

خواجہ کیا داستانِ غم لیکر بیٹھا ہے، کیوں بھولے ہوئے
 دکھڑے یاد دلاتا ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کالے دوست نہ چھیڑ
 نہ سنا جائے گا ہم سے یہ نسا نہ ہرگز
 داستانِ گل کی خزاں میں نہ سنائے بلبل
 ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز
 دھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہاؤ مطرب
 در داغِ غزل کوئی نہ گانا ہرگز

اچھا خفا نہ ہو جے، مطربِ فرج واں نعمہ جانگداز سے پہلے زفر مہ
 قص آدھ چھیڑتا ہے۔ ساز کو تنت پر بجانے سے پہلے چلت پھرت کی گت

نذر ہے۔

کیوں صاحبِ افسانہ غمِ داستانِ عیش سے بدل جائے تو کیسا
مجلسِ عزاداری محفلِ مولود بن جائے تو کیا خوب۔ مرگِ دہلی کا ذکر
ہوتا رہے گا، مولودِ دہلی کا تذکرہ سنئے۔

صاحبِ سنی سنائی بات ہے، بڑوں نے کہی ہمارے کان
پڑی، آپ تک پہنچا دی۔ پانچ پت آباد ہوئے، چار کا پتہ چلتا ہے۔
پانچویں کا نشان نہیں ملتا۔ پانی پت، سونی پت، مارپت، باگ پت
خیال ہے کہ پانچواں پت جو لاپتہ ہے۔ دلی بن گیا۔ راجہ انگ پال۔ اس
راج دھانی میں راج راج رہا تھا کہ فرشتہ اجل نے فرمانِ قضا دیا۔ اولاد
نرینہ نہ تھی، نواسہ پر پتھوی راج جو اجمیر کا راجہ تھا وارثِ تاج و تخت ہوا۔
ہندوؤں کا ستارہ شہاب الدین کے ہاتھوں غروب ہوا۔
پر پتھوی راج مارا گیا۔ مسلمانوں کا نیرِ اقبال چمکا عروسِ سلطنت شہاب الدین
سے ہم آغوش ہوئی۔ ع کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی۔
ع عطار دقلم در سیاہی نہاد۔ شہاب الدین شہابِ ثاقب ہوا۔
اس کا سپہ سالار قطب الدین تخت نشین۔

انجام کا رقبہ الدین بھی افقِ فنا میں غروب ہوتا ہے اور اس کا
 داماد شمس الدین التمش آفتابِ جہاں تاب بن کر چمکتا ہے۔ ولے
 تاج کے۔ چند روز چمک و مک دکھا کر بالآخر غربِ مرگ میں غروب
 ہوا۔ لڑکا آرام شاہ اسم با مسے تھا۔ چندے رنگ رلیوں میں رہا۔
 زمانہ نے رنگ بدلا، نیزنگ فلک رنگ لایا۔ حکومت کا رنگ پھیکا
 پڑنے لگا۔ اس کی بہن رضیہ سلطانہ کے ہاتھ میں عنانِ سلطنت آئی
 اداہار کی کچھ ایسی کالی گھٹا چھائی کہ سفلیہ نوازی کے ہاتھوں سیہنجستی
 سے دوچار ہوئی اور حکومت ہاتھ سے گنوائی۔

ہر کہ آمد عسارت نو ساخت

رفت و منزل بدگیر سے پرداخت

کے قباد نے کیلو کھڑی آباد کی جو آج تلو کھڑی کے نام سے یاد کی جانی
 ہے۔ انجام کار کے قباد سازشوں کا شکار ہوا اور اس کا سپہ سالار
 جلال الدین خلجی تخت پر بٹھایا گیا۔ یہ مردِ خدان سازشوں میں شامل نہ تھا
 ولے قرعہ فال اس کے نام پڑا۔ اس نے گوارا نہ کیا کہ جس تخت پر
 اس کے آقا بیٹھے تھے اسی پر یہ بھی بیٹھے۔ پس ایک اور شہر کی بنا

ڈالی۔ یہ تلوکھڑی کے قریب ہے۔

ابن چہ شوریست کہ در دور قمری بنیم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شمری بنیم
دختران را ہمہ جنگ است و جدل با مادر

پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بنیم
میدان کارزار راستہ ہوا، بھتیجا چچا کے خلاف کمر بستہ
جواں بہت۔ جواں بخت علاؤ الدین بڑھے چچا کو مار کر تخت نشین ہوا
دلی کی داغ بیل ڈالی اور قطب مینار کی طرح خسرو شاہ غاصب نیاٹ الدین
کے ہاتھوں کیفور کردار کو پہنچا۔ غیاث الدین برسرِ اقتدار آیا۔ غیاث
پورا باد کیا، حضرت نظام الدین محبوب الہی کے منہ آیا، منہ کی
لکائی، بیٹے محمد تغلق نے یہ آفت ڈھائی کہ باپ کے سر پر مکان کی
چھت گرائی۔ اور وہ مردِ داس میں دب کر رہ گیا۔ جب یہ واقعہ
ہو رہا تھا حضرت سلطان جی محبوب الہی ٹھل رہے تھے اور
بار بار زبان مبارک پر یہ شعر آتا تھا۔

لے کر بیک چراغ نشینی بجائے خویش باشیر پنجرہ کردی دیدی سزلے خویش

فیروز شاہ نے اپنی دہلی الگ بسائی، کوئلہ فیروز شاہ، کلاں مسجد
اور پرانی عید گاہ یاوگا رچھوڑ گیا۔

وقت کوتاہ و قصہ طولانی، انجام کار نوبت شاہجہاں سید
یہ شہر سا بسا، یہ پودا پھلا پھولا، یہ بچہ پروان چڑھا اور کچھ ہوا ایسی
موافق آئی کہ دن دو دن اور رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ بحریات میں
باد مخالف بھی چلی، باد شرط بھی، طوفانِ حوادث نے کشتی کو ڈوگر کا دیا۔
ملاح امید چھوڑ بیٹھے، پر قسمت نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بادِ قاتل
میں ٹھانے تھی کہ آج اس بیڑہ کو ڈبو کر چھوڑوں گی۔ قسمت نے بیڑا اٹھایا
تھا کہ بیڑہ پار لگاؤں گی، کالی گھٹائیں آسمان پر چھپائیں۔ برسیں بھی برسایا
بھی۔ پر ہریلِ بلا کے بعد اس نے وہ جو بن لکھا را کہ باید و شاید۔
جسے وہ رکھے اسے کون چکھے۔ افتادیں بھی پڑیں۔ لکھنویں بھی بھگتیں
جھٹکے بھی لگے، پر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ بلائیں آئیں۔ بلا گرداں کیا۔ خیر
خیرات دی۔ صد قمر کیا کوئی آفت آئی مکان بدلا۔ لیجئے آئی ٹل گئی
نادر بلائے بے درماں کی طرح آیا۔ نواور نذر پکڑائے، ہاتھوں کے
طوطے اڑ گئے۔ سخت طاؤس دے کر بیڑہ چھڑایا۔

شعہ کی بلا اس مریض نیم جاں کو بے جان کے بغیر نہ ٹلنی تھی
 نہ ٹلی۔ ایک آفت ہوتی تو بھگت لی جاتی۔ یہاں تو مصیبت نے گھر گھر
 رکھا تھا۔ ایک سے چھٹکارا نہ ملتا تھا کہ دوسری پڑتی تھی۔

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا

پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی
 یہاں جینے کی نوبت بھی نہ آتی تھی کہ دستِ قضا دستِ تاراج
 دراز کرتا تھا۔ بقول غالب۔

”پانچ لشکر کا حملہ پے پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر
 اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیزوں کا، اس میں جان و مال
 ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔
 تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے، چوتھا لشکر مہضیہ کا
 اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے، پانچواں لشکر تپ کا۔ اس میں
 تاب و طاقت، عموماً لٹے مرے آدمی کم۔ لیکن جس کو تپ آئی اس نے
 اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے کوچ نہیں کیا۔
 میرے گھر میں دوا آدمی تپ میں مبتلا ہیں۔“

خواجہ جلدی کر سوانگ باقی بہت ہے، شب کم ہے۔ قصہ کوتاہ
 دلی لٹی، دلی ولے خانماں خراب ہوئے، نوجوان مارے گئے، بڈے
 ٹھڈے شہر چھوڑ کر بھاگے جس کا جہاں سینگ سمایا جا چھپا، اکثر بے
 گئے، بہت شہر بدر ہوئے، دلی ولے کا دلی میں ٹھکانا تھا۔ جو بھاگ
 نکلا بچ گیا، جو رہ گیا مارا گیا۔

ع۔ جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے بڑا اس کے گز
 زمانہ میں اس طوائف الملوکی کے عالم میں۔ اس سرزمین نے ایسی ایسی
 زندہ جاوید مستیاں پیدا کیں جو آج تک چشم و چراغ ہندوستان ہیں۔
 سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
 اللہ اللہ کیا کیا داغ ہوں گے جو تلوار کے گھاٹ اتر گئے۔ جو
 اس طوفان بلا سیل حوادث کے ہاتھ سے بچے وہ بھی اتنے ہیں کہ آج تک کسی
 شہر نے بیک وقت اتنے صاحب کمال پیدا نہ کئے ہوں گے۔

ع۔ دردے دھمت دردے کارے دھمت کارے۔ وہ صورتیں
 نہ رہیں، ان کے دیکھنے والے بھی مر کھپ گئے۔

ع۔ اں قدح بشکت و آں ساقی نہ ماند۔ وہ صحتیں نہ رہیں، وہ
 دو ختم ہو گیا۔ محفلوں کو جگا دینے والے، دماغ تیر خاک جا سوئے
 باغ اجڑ گیا داستان گل و بلبل طے ہو گئی۔ ہم آج ان ناموں کو ڈھونڈ
 بیٹھے ہیں جو ہمیشہ کے واسطے صفحہ ہستی سے مٹ گئے جن کی یادیں
 فراموش ہو گئیں، جن کا نشانِ مزار بھی نہ رہا۔
 ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو

ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک
 ہر کیف کھوج لگائیں گے، پتہ چلائیں گے اور جو بھی مل گئے
 ان کو انشاء اللہ آپ سے لا ملائیں گے۔



یہ کون جو گن رنار مائے بیٹھی ہے۔ ع۔ سینہ میں یاس و حسرت
 و درماں لئے ہوئے۔ ع۔ بال بکھرے ہوئے زلفوں کے ادھر اور ادھر
 شاہانہ شان بشرہ سے عیاں، پر چہرہ پر کچھ ہوائیاں سی اڑ رہی ہیں۔
 ع۔ اور غم کے ہاتھوں اس کی اتری ہوئی ہے صورت۔
 چشمے گوں میں آنسو چھلک رہے ہیں، رنگے روپ کچھ بد رنگ سا

نظر آتا ہے۔

زلفیں الجھ رہی ہیں ہے سوگوار حالت

افتال اڑی ہوئی ہو رنگ حنا کی صورت

ہونٹوں پر لاکھا ہے کچھ اڑا اڑا آنکھوں میں سرمہ ہے پر پھیکا پھیکا
حسرت کی کشمکش میں حیران ہو رہی ہے۔ خانہ خرابیوں سے ویران ہو رہی ہے
جو گن جی دربار جمائے بیٹھی ہیں، پر دربار کچھ ادبار زدہ سا معلوم ہوتا ہے
نقیب سیاہ پوش مجمر آتش در دروں عود سوز سینہ سوزاں
شمع اشک فشاں، لالہ دلغ در دل۔ بوئے گل پریشاں، صراحی سر بریدہ
جام میں دیدہ تر جھلک رہا ہے۔

اُسیے ذرا قریب سے دیکھیں یہ کون دیوی جی ہیں جو جو گن کے
سروپ میں درس دے رہی ہیں اوہویہ تو دلی ماما ہیں، ان پر کیا بیتا
پڑی جو بھرا پڑا گھر چھوڑ دھن دولت تچ، جو گن کا برن لے خجگل اُن بسایا
ماتا جی شہر کیوں چھوڑا، گھر بار سے منہ کیوں موڑا، آبادی سے
من کیوں گھبرایا۔ دیرانا جی کو کیوں بھایا

دلی ماما نے آنکھ اٹھائی۔ دل پُر درد سے آہ سرد کھینچی۔ اور کہا

بن ماں کیسا مالوا۔ اور بن پی کیا سسرال۔ میرا سہاگ اُڑ گیا، میرا پی
مجھ سے بچھڑ گیا۔ میری دنیا بدل گئی، مجھ سے زمانہ نے آنکھیں پھیر لیں،
میرے لال خاک میں مل گئے، میرا سائیں دیں بدر ہو گیا۔ ع
اب شان کہاں باقی ہم شان لٹا بیٹھے۔ اتنا کہنا تھا کہ آواز بھڑ گئی، آنکھوں
سجیں آنسو بھڑائے ع بیٹھے بیٹھے لے کیا جانے کیا یاد آیا۔ پھر سرنگوں
ہو بیٹھی،

درباری آنے شروع ہوئے، دربار جتنے لگا۔ یہ کون سمیلا جوان
ہے۔ بلند۔ بالادور زشی بدن۔ چوڑی ہڈی، رنگ سرخ و سپید۔ ذرا آنکھ
تو دیکھو، خون کبوتر معلوم ہوتی ہے

سنو بھاٹ کیا کہتا ہے۔ مرزا فخر و عرف مرزا چپاتی، شاہی خاندان
سے ہیں۔ جو گن نے یہ نام سنگہ سیر اٹھایا۔ اور مرزا صاحب موصوف کی
طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیز نے سیت
شہزادوں اور سلاطین کا یہاں کچھ کام نہیں۔ آج صرف صاحب کمال
پیش کئے جائیں، اگر ان میں بھی کوئی کمال ہے تو جگہ دی جائے
ورنہ ان کی گنجائش نہیں۔ بھاٹ نے درستی بہتہ مؤدبانہ عرض کی۔

خانہ زاد گوش گزار بارگاہ خداوندی کرتا ہے کہ حسب الحکم اعلان عام کر دیا گیا ہے کہ آج صرف صاحب کمال آئیں اور کوئی آنے نہ پائے آج جو بھی شرف باریابی حاصل کرے گا کسی نہ کسی علم یافتہ کا مل ہوگا۔ اجازت ہو تو حلقہ بگوش بارگاہ عالی مرزا صاحب کے حالات عرض خدمت کرے، اشارہ ہوا، اچھا کہو۔

غدر کے بعد جیب دہلی والے بھوکوں کے مارے در بدر ٹھوکر ہیں کھاتے پھرتے تھے، اس نفسی نفسی کے زمانہ میں اس مرد خدا نے سنکر جاری کر رکھا تھا، جب دنیا دانہ دانہ کو ترس رہی تھی، اس کے دروازہ پر دبغیں چڑھ رہی تھیں۔ اور سخاوت کا بازار گرم، حلوہ چپانی عام تقسیم ہوتا تھا۔ اس وجہ سے عوام میں مرزا چپانی مشہور ہو گئے۔ دلی میں امن و امان ہو گیا، کاروبار کا بازار گرم مفلس تو نگر ہو گئے اور یہ تو نگر ہی دست اس وقت شکل بنانے والا ان سے بہتر نہیں ہے۔ ان کے مقابلہ کا پیراکہ تمام ہندوستان میں نہیں۔

کبوتر بھی لا جواب بناتے ہیں، ان کے کبوتروں کی یہ خصوصیت ہے کہ کسی گھر کے گرد ان نہیں ہوتے، ٹھیلے میں بند رہتے ہیں۔ جس گلی

کوچہ میں چاہتے ہیں اپنا ٹھیلالے جاتے ہیں۔ اور کبوتر اڑنے شروع کر دیتے ہیں۔

یہ سن کر ولی نے منجم قدرت جو حاضر دربار تھا اس کی طرف آنکھ اٹھائی اور کہا یہ وہ مرزا فخر وہیں جو گیا رہ برس کی عمر تک گودوں میں پھرے ہیں۔ بتاؤ ان کا انجام کیا ہوگا۔

زمانہ برسرِ پناش ہے۔ گیا رہ برس کی عمر تک گودیوں میں چڑھے پھرنے کا کفارہ ان کو بڑھاپے میں ادا کرنا پڑے گا۔ یہ نازوں کا پالازین کا گزبنے گا۔ روزانہ بائیس چوبیس میل پھرنا مقدر ہے۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کبوتر اور گڈیاں سچپتا ہوا مرے گا۔ زندگی دو بھر ہو جائے گی۔ جس کے دروازہ پرھن برستا تھا کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگا۔ غدر کے زمانہ میں سینکڑوں بھوکوں کا پیٹ پالنے والا خود فقروں فاقہ میں گذر کر کے خراب و خستہ جہانِ گدازان سے گذر جائے گا۔ یہ ہے ان کا اندوہناک مستقبل۔

دلی ماتا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی اور مرزا چپاٹی کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ دل ہاتھوں سے

نکلاتا تھا کہ عین تنت پر دور سے ستار کی آواز سنائی دی،
 نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک سانپ رنگ کا آدمی بمنزل آنکھوں والا چہرہ
 سے جاہ و جلال کے آثار نمودار، اپنی دہن میں بیٹھا ستار سجا رہا ہے،
 بھاٹ نے مرزا کا لے لقب بتایا، بہادر شاہ آخری تاجدار ہند کا قریبی
 رشتہ دار اور فن ستار نوازی کا استاد بے بدل۔ جو گن جی منجم
 قدرت کی طرف مخاطب ہوئیں اور کہا، بتاؤ فلک فتنہ سازان سے کیا
 راگ لائے گا۔ طالع فرمان منجم نے زائچہ دیکھا اور عرض کی، زمانہ کے
 ہاتھوں بری گت بنے گی، جو فن ہاتھ میں ہے۔ اس کی بدولت ٹکڑا کما
 کھائیں گے، بارگاہ عالی سے ارشاد ہوا، مفصل بیان کر دو، خادم مزاج
 وال نے دست بستہ عرض کی، داستان دردناک ہے اور نعمت جال گلا
 اسے نہ چھیڑیں تو بہتر حکم صادر ہوا ہم سنا چاہتے ہیں، داستان
 منجم کم و کاست بیان کی جائے۔ منجم ازل سے زبان پر وہ درکھولی
 اور کہا، میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک جوگی بروگی بھبھوت ملے گیر واکیر

ملہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے ملہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے

ملہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ ملہ ستار کے ایک حصہ کا نام ہے

پہنے گوایر دربار میں کھڑا ہے، ستار جان کے ساتھ جو حکم ہوتا ہے۔ کچھ چھیڑو۔ دربار کا ستار نواز دست بستہ عرض کرتا ہے کہ اگر اجازت ہو تو پہلے خانہ زاد پیش کرے۔ اشارہ ہوتا ہے اچھا تو شروع کر صاحب کمال ہے کمال دکھاتا ہے۔ وہ وہ تان پٹے لیتا ہے۔ ایسے ایسے سوت مین ٹھہکھینچتا ہے کہ باید و شاید محفل پر جادو سا کر دیتا ہے، کچھ ایسا رنگ جاتا ہے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے ہیں، صاحب نظر جان جاتے ہیں کہ اب کالے خاں کا رنگ جتنا دکھائی نہیں دیتا۔ جب وہ ختم کرتا ہے تو کالے خاں کو حکم ہوتا ہے۔ جو چیز اس نے شروع کی تھی۔ وہی یہ بھی چھیڑتا ہے، صاحب فہم دیوانہ سمجھتے ہیں جانتے ہیں کہ بھلا اس میں کیا عہدہ برآ ہو سکتا ہے، اس موٹے کے آگے اس میرانی کا سحر سامری نہیں چلتا، چاند کے سامنے نہ مخشب نہیں ٹکتا، ان کی آن میں محفل کو مسخر کر لیتا ہے، جو انگ اس میرانی نے دکھائے تھے وہ سب پیش کرتا ہے اور پھر اپنا راستہ الگ نکالتا ہے، نئے سوت نرالی

۱۷ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ ۱۸ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔

۱۹ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے
۲۰ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے

بند ہیں۔ انوکھا انگ، نرالا رنگ، زمانہ کی آنکھیں دیکھا ہوا میراثی اس
 نام نہاد کالے خاں کی آنکھوں کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ مغلیہ آنکھ شاہانہ
 سچ و سچ نظر آتی ہے، تا طبعاتا ہے۔ دست بستہ عرض کرتا ہے، سرکار
 یہ لال پردہ ہے، آپ کالے خاں نہیں مرزا کالے ہیں۔ اپنا اصلی نام
 سن کر رنگِ رو متغیر ہو جاتا ہے۔ پُرانا ٹھاسٹ آنکھوں کے آگے پھر جاتا
 ہے۔ طبیعت کو مشکل سمجھاتا ہے۔ ارباب محفل وطن دریافت کرتے
 ہیں، بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

گل ہوں تو کوئی چمن بنناؤں

غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

ہم فقیروں کا کیا گھر کیا ورع و ریش ہر کجا کہ شبِ آمار لے اوست
 اس بے سرو سامانی کو دیکھ کر لوگ استفسارِ حال کرتے ہیں۔ آنکھ اٹھا کر
 ان کی جانب دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

چہ پر می از سرو سامان من عمر بستہ چوں کا کل

سیہ ختم پریشاں روزگارم خانہ بردشتم

ہمارا ج میراثیوں میں نہیں مصاحبوں میں جگہ دیتے ہیں، اور مرزا کالے کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔ دست بستہ عرض کرتا ہے کہ مرزا کالے صاحب عالم دہلی غدر میں مارے گئے، اب تو یہ روسیہ کالے خاں زندہ ہے۔ سرکار اگر آئندہ کالے خاں فرمائیں تو کرم ہوگا باقی زندگی اس گمنامی کے عالم میں گزار کر راہی ملک عدم موتا ہے یہ ہے ان کا مستقبل۔

منعم قدرت اتنا کمر خموش ہو گیا اور محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھی ہچکچوں کی آواز آتی تھی گاہ گاہ کسی کو نے سے آہ سرد اٹھتی تھی کہ اتنے میں طبلہ پر تھاپ پڑی اور بھاٹ نے آواز لگائی، مرزا فیروز شاہ تشریف لاتے ہیں۔ یہ طبلہ کے استاد بے بدل ہیں جوڑی بجانے میں دور دور ان کا جوڑ نہیں، اکثر نئے پرانے اور بولوں کے موجب ان کے بول اب تک صرف دلی کے میراثی جانتے ہیں، باہر کے نہیں رنگیلے جو ان ہیں۔ محفل رنگ و بو کے شوقین۔ مرزا فیروز شاہ بھی سم پورن اترے اور دربار میں حسب مرتبت جگہ پائی۔ اوہو یہ

لے طبلہ کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ طبلہ کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔

کندھوں پر بندوقیں رکھے، گلے میں تو بڑے لٹکائے کون چلے آتے ہیں، منٹے بھاٹ کیا کہتا ہے،

مرزا علق سلطان صید افگنی میں یکتائے روزگار ہیں، ہرن کے منشاء کو سمجھتے ہیں، ان کا مارا پانی نہیں مانگتا۔ مرزا دریں جانور کا کھوج لگانے میں عدیم المثال ہیں۔ مرزا قادر الدین قیامت کے قادر انداز جس پر ان کی نظر پڑ جائے کیا مجال جو بچ کر نکلیجائے۔ مرزا جہانگیر جس ہرن کو ایک مرتبہ جنگل میں دیکھ لیں مہینوں بعد پہچان جائیں۔ مرزا غیاث الدین جناب کو دیکھ کر شکار الغیاث پکارتا ہے پر پناہ نہیں پاتا ذرا سنو یہ چڑیوں کی آواز کہاں سے آنے لگی۔ بھلا جس جگہ ایسے شکاری ہوں وہاں پرند کے پر چلتے ہیں۔ پھر یہ آواز کہاں سے آرہی ہے بندہ نواز! یہ تو کوئی بزرگوار ستار بجا ہے ہیں، والد عجیب مضرب لگاتے ہیں، بالکل چڑیاں چپکتی معلوم ہوتی ہیں۔ بھاٹ نے آواز دی مرزا چڑیا تشریف لاتے ہیں۔ یہ ستار نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے، کھٹا ستار بجاتے ہیں۔ مضرا میں کچھ ایسی ایجاد کی ہیں کہ ستار میں سے بالکل چڑیوں کی آواز نکلتی ہے۔ اگر کہیں پر وہ بجائیں تو

معلوم ہوتا ہے بہت سی چڑیاں چوں چوں کر رہی ہیں۔ ان کا ستار
سن کر دلی ماتانے آنکھ اٹھائی اور قدرے مسکرائی۔ منجم ازل کی جانب
نظر ڈالی اور ان کا مستقبل بیان کرنے کا حکم دیا۔

خادم حلقہ بگوش عرض پرداز ہوا کہ دنیا ان کی قدر کرے گی، پر
یہ کہیں ٹکیں گے نہیں، ان کے پاؤں میں گردش پر کار ہے، لوگ ان کی
خدمت کریں گے۔ مگر یہ دو چار دن سے زیادہ کہیں بسیرا نہ لیں گے
آٹھ آنے سے دس روپیہ تک کی گت ان کے پاس تیار رہے گی،
اس پر گذراوقات ہوگی۔

یہ دو کج کلاہ کتابوں کے پشتارے بغلوں میں دبائے، کانوں میں
قلم لگائے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کون چلے آ رہے ہیں۔ بشیرہ سے علم داؤد
کے آثار نمودار ہیں۔ محفل میں جگہ کی گئی۔ بھاٹ نے مودبانہ آواز لگائی
مرزا مجاہد الدین اور مرزا محمود شاہ تشریف لاتے ہیں۔ فارسی اور
عربی پر کامل عبور رکھتے ہیں، اردو اور فارسی نظم و نثر میں ان کا جواب
نہیں۔ منجم اشارہ پا کر کھڑا ہوا اور کہنے لگا، دولت علم سے مالا مال ہیں
یہ کبھی تہی دست نہیں رہ سکتے۔ مرزا مجاہد الدین نثر میں جدوجہد

کریں گے اور یکتائے روزگار ہوں گے، حیدر آباد دکن میں نامہ نگاری پر قوت کی بنیاد ہوگی۔ دوسرے صاحب مسجد فتحپوری میں علم کا دریا بہائیں گے۔ اور دنیا کو فیض یاب کریں گے۔

اتنے میں مرزا قادر بخش تشریف لائے۔ بھاٹے نے عرض کی علی مد بنوٹ اور پھیری گنگہ کا استاذ بے بدل ہے۔ اور یکتا کشتی گیر، ایشیا کی دس بارہ زبانوں پر قدرت رکھتا ہے، ہنرمند قدرت اشارہ پارک یوں عرض پر دراز ہوا۔ دہلی کی تباہی کے بعد یہ لال قلعہ کا لعل دیار حبیب کی راہ لے گا۔ پردلی کی یاد وہاں بھی چین سے نہ بیٹھے دے گی مٹی پھر کشاں کشاں دہلی لائے گی۔ برے حالوں باندے دھارے نن پر چھڑے لگائے پیٹ پر پتھر باندھے، شبنم اور آب رواں کا پہننے والا، نادوں کا پالا اس اُجڑے دیار میں پھرائے گا۔ یہاں کی دنیا بدلی ہوئی، یہاں کارنگ بگڑا ہوا پائے گا۔ مرزا شریا جاہ خوف خدا کھا کر بطریق غریبا پوری خان پور لگا ہی پر لگادیں گے، یہ بلبیل ہزار داستان دس بارہ زبانوں میں چمکنے والا گنواروں کے ساتھ سر پھوڑتا ہوا ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج، پیسہ پیسہ جمع کرتا راہی ملک عدم ہو گا۔ ہنم اتنا کہہ کر

خموش ہو گیا۔ درباریوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہ رہے تھے۔ ولی ماما کی بچی بندھی تھی۔ سر اٹھایا اور کہا یہ یادگار تیمور ہیں، یہ بابر کی اولاد ان کے ہاں بچہ ہاتھ میں تلوار لئے، سر پر تاج رکھے پیدا ہوتا تھا، آج ان کا یہ دھاڑا ہے۔

بہت آگ چلیوں میں سلگانے والے بہت گھاس کی گھٹڑیاں لانے والے
بہت در بدر مانگ کر کھانے والے بہت فائدہ کر کے مرجانے والے

جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں یہ جوہر

تو نکلیں گے نسلِ ملوک ان میں اکثر

انہیں کے بزرگ ایک دن حکمراں تھے انہیں کے پرستار پیر و جواں تھے

یہی مامن عاجز و ناتواں تھے یہی مرجعِ ولیم و اصفہاں تھے

یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی

انہی کے گھروں میں تھی صاحبِ قمرانی

یہ لے قومِ اسلام عبرت کی جا ہے کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے

جسے سنئے افلاس میں مبتلا ہے جسے دیکھے مفلس و بینرا ہے

لے تعلق آباد کے گھیساروں کی طرف اشارہ ہے۔

نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

بالکمال اولاد سلاطین کا ابھی ایک حجم غفیر کھڑا تھا، بھاٹ کچھ اور
شہزادے پیش کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ حکم ہوا کہ ان کو حسب مرتبت جگہ
دی جائے، اب ان کا حال تباہ سننے کی ہم میں تاب نہیں۔

یہ کون ماہ نیم ماہ نیرتاباں علم علم اٹھائے چلا آ رہا ہے، جس کے
عقب میں بہت سے درخشندہ ستارے ہیں اور ان کے نیچے نوجوانوں کا
ایک ہجوم۔ اوہو یہ تو سرسید احمد خاں صاحب اپنے حواریں کو لئے
آ رہے ہیں۔ اور مسلمان طلبہ کا ایک مجمع ٹرکش کوٹ اور سرخ ٹوپیاں
پہنے ساتھ ہے۔ اس گروہ میں سے سرسید مع تین حواریوں کے آگے
بڑھے۔ بھاٹ نے کہا سرسید احمد خاں صاحب بانی علی گڑھ کالج۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے امام تشریف لاتے ہیں، اور ان کے
ساتھ منشی ذکار اللہ، ڈاکٹر نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی بھی
ہیں۔ منشی ذکار اللہ صاحب علم ریاضی کے استاد بے بدل، ڈاکٹر
نذیر احمد اور مولانا حالی کے نام پر محض میں چہنی گویاں ہونے لگیں بجنوراؤ

پانی پت کا نام لوگوں کی زبان پر آیا۔ بھاٹ دربار کی یہ فضا دیکھ کر
 دم بخود رہ گیا۔ سرسیدان دونوں کا ہاتھ پکڑا آگے بڑھے اور کہا۔ ڈاکٹر
 نذیر احمد نے جنم بجنور میں بیشک لیا۔ لیکن علم اس سرزمین پر سیکھا
 تربیت یہاں پانی، عمر یہاں گذری، یہاں کی مٹی تھی، انجام کاریہیں کی
 خاک میں جالی۔ ان کا دل، ان کی طبیعت، ان کی خوبصورت میرا زمہ
 دلی کی تھی، مولانا حالی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ پر پلے دلی میں ۔

پردان یہاں چرٹھے، دلی والوں سے زیادہ دلی کے ولدادہ ہیں
 اس شہر سے نسبت ازلی رکھتے ہیں جیسا کہ ان کے اشعار سے پٹکتا ہے۔

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر

جانا کہ نہیں اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

حالی بس اب یقین ہے دلی کے ہوئے

ہے ذرہ ذرہ مہر فنا اس دیار کا

سرسیدی کی سند پران دونوں بزرگوں کو دلی والا قرار دیا گیا

اور دربار میں حسب مراتب جگہ پائی ۔

ایسا کون آنے والا ہے کہ ارباب دربار موزب ہو نیٹھے ۔

گوش بر آواز، نظریں منتظر قدم بوسی۔ بوئے گل پیک ہو اپر سوار ہوا
 خواہی کوتالب فرش حاضر۔ دود و دوسوز بلا گردانی کرتا چلا آ رہا ہے برقم
 میں کون سی جادو آیا کہ نیم جانوں میں جان آئی، بے جان زندہ ہو گئے
 ہوا کا مزاج بدل گیا۔ محفل کی طبیعت رو بہ اصلاح ہوئی، افسردہ دروں
 شگفتہ دل ہو گئے۔ رنگِ رد تو دیکھو شاخِ نبات میں گل شفتا لو کی
 جھلک دکھا رہا ہے۔ غلامی آنکھ دوائے دردِ دل، برگ گل سے ہونٹ
 تعویذ سکونِ قلب، کتابی چہرہ نسخہ آبِ حیات، ورزشی بدن۔
 اس پر جامدانی کا انگرکھا، آدھا سینہ کھلا ہوا۔ کھڑکی دار پگڑی سر پر۔ خدمت
 پر آمادہ، افضل الاشغال خدمت الناس کا دلدادہ۔ یہ کون جو انجنت
 جو ان ہمت ہے۔ بھاٹ کیا کہتا ہے۔

حکیم حاذق طبیب کا مل حکیم محمود خاں صاحب تشریف لاتے ہیں
 اخلاق حمیدہ کی تصویر شرافت و نجابت کا مجسمہ، حضرت خواجہ عبید اللہ
 احراری رحمۃ اللہ علیہ کی نسل میں سے حکیم محمد تشریف خاں صاحب کی
 اولاد۔ دلی ماتا نے ان کی طرف محبت اور التفات سے دیکھا اور
 حکم دیا کہ کچھ اور حالات بیان کئے جائیں۔ بھاٹ نے دست بستہ

عرض کی کہ حکم کا بندہ، فرمان کا فرماں بردار، اگر اجازت ہو تو کچھ عرض
بارگاہِ خداوندی کرے۔ حکم ہوا کہو۔ با ادب یوں عرض پرداز ہوا۔ خانہ زاد
کے پاس الفاظ نہیں کہ ان کے صفات اور حالات کا حقہ بیان کر سکے
اگر یہ کام مولانا حالی کے سپرد ہو تو مناسب۔ اشارہ پا کر مولانا حالی سرودند
کھڑے ہو گئے اور یوں سخن سرا ہوئے۔

یہ نم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب

خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

طب یونانی کا آخری ناخدا، اس ڈوبتے ہوئے بیڑہ کا کھینچا ہار
شرافت کا پتلا، نجابت کا مجسمہ، خوبیوں کی زندہ مثال۔ فخر شہر، فخر خندہ
خصال۔ جب دلی کا جہاز تباہی میں آیا ہوا تھا۔ جب سیلاب بلا، گرداب
فنا کے تھپیڑے اس بیڑہ کے ٹکڑے اڑائے دیتے تھے۔ اس کا ایک
ایک تختہ نذر امواج حوادث تھا۔ اور پھر ان تختوں کی چھپٹیاں تتر تین
ہونی جانی تھیں کسی کو کسی کا سہارا نہ تھا، ناخدا ہمت ہار چکے تھے، ملاحوں کو
اپنی اپنی پٹری تھی۔ یہ کوہِ راسخ مردِ میداں، جودی پہاڑ بھی تھا، نوح بھی
کشتی بھی تھا ملاح بھی، بے ٹھکانوں کا ٹھکانا، بے سہاروں کا سہارا،

مصیبت زدوں کا بلجا۔ آفت رسیدوں کا ماوے، مرتے ہوؤں کو
 آبِ بقا، بے گناہوں کا گواہ، برے وقت کا ساتھی، بُری بنی کا یار،
 دلی کی مٹتی ہوئی تہذیب کی امٹ یا دگار، جب دلی میں غدر پڑ رہا
 تھا، اس شہر کو مصیبتوں نے گھیر رکھا تھا زمانہ دلی والوں کا دشمن تھا
 سر چھپانے کو بھی انہیں کہیں ٹھکانا نہ تھا، اس وقت اس شریف نے
 ان پر وہ احسانات کئے ہیں جن کے حق سے دلی ولے عہدہ برآ
 نہیں ہو سکتے، آج سینکڑوں گھرنے اس کی بدولت پل رہے ہیں۔
 ہزاروں اس کے طفیل میں عزت لئے بیٹھے ہیں، لاکھوں کی جائیداد پائی
 سینکڑوں کی جائیں، ہزاروں کی امانت گھر پر رکھی اور اس کی جان سے
 زیادہ حفاظت کی۔ وہ محمود خاں جو بغیر سواری کبھی باہر نہ نکلاتھا،
 جس نے عدالت کچہری میں کبھی قدم نہ رکھا تھا، بے گناہوں کے لئے
 وہ رات دن چکر میں تھا۔ پاؤں ایک اس کا عدالت میں تھا۔ اور ایک گھر میں تھا
 مولانا حالی اتنا کہہ کر بیٹھ گئے، دلی ماتا کا اشارہ پا کر نقیب نے حکیم
 صاحب موصوف کو صدر محفل جگہ دی۔

ٹھوڑی تارا، ماتھے چاند، سوج کی سی کرن، رنگ میدہ و شہاب

سُواسی ناک، غلائی آنکھ، چہرہ کی چھب دل میں کھٹی جاتی ہے۔ ہر عضو بدن
 سانچے میں ڈھلا ہوا، عجب سچ و سچ سے چلا آتا ہے۔ یہ کون جوان ہے
 کہ اہل دربار سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں جس کی جہاں نظر پڑی
 جم کر رہ گئی۔ عکس کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ بے ساختہ زبان
 پر آیا۔ ۵

بسانِ شکلِ توبت کمتر آفرید خدا

ترا کشیدہ دوست از قلم کشید خدا

یہ نیرتاباں شمس الدین خاں والی فیروز پور دلو ہارو ہے بھاٹ
 نے اہل دربار سے تعارف کروایا اور کہا، آفتابِ حُسن ہے اور تمام
 فنونِ سپہ گری کا مسلم البیوت استاد۔ شاعر ہے اور بڑے پائے
 کا نقاد، اس کا دربار اہل کمال اور اہل علم کا ملجا و ماوے ہے۔ منجمِ قدرت
 نے عرض کی، یہ ماہِ رو پھانسی چڑھے گا، دلی ماتا نے آہ کی۔ منجمِ خموش
 ہو گیا۔ ارشادِ عالی ہوا، واقعہ مفصل بیان کرو۔ عرض کی، داستانِ
 غم ہے، جوان کا ماتم ہے۔ افسانہ ناگفتہ بہ۔ فرمایا

امتیازِ علم و جور و ستم بھی نہ رہا کثرتِ غم سے اب اندازہ غم بھی نہ رہا

کہو اور بے کم و کاست کہو،

مہنم خونی بیان زبان نوحہ خواں سے نواسخ ہوا کہ
زرو زن است وز میں مایہ فساد و نزع

نزا بجان برادر کہ دل بہایں نہ ہی

اس بربادی میں بھی انہی کا دست تفرقہ انداز کام کر رہا ہے
نواب احمد بخش خاں صاحب دالئی فیروز پور دلوہارو کے دو محل ہیں
ایک کی اولاد میں یہ مہریم روز شمس الدین خاں ہیں۔ دوسری کے
ابن سے نواب امین الدین خاں صاحب اور نواب صبار الدین خاں
صاحب، بڑے لڑکے کو فیروز پور کہ حاصل ریاست ہے عطا ہوتا
ہے، اور آخر الذکر دونوں کو لوہارو، نواب احمد بخش خاں صاحب
خلد آسٹھیا بنی ہوئے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ نواب امین الدین خاں صاحب کے صاحبزادے
کج مشورت، مطلبی آشنا اور دلوں میں فرق ڈالنے والے
گھیرے بیٹھے ہیں۔ محبت و یگانگت کی بنیاد کھودے ڈالتے ہیں
عناد و فساد کی طرح ڈال رہے ہیں۔ باپ کی ماتم پرسی کرتے جاتے

ہیں اور زہرا لگتے جاتے ہیں۔ سم قاتل گھول رہے ہیں۔ زہرا اثر کر چلا۔
 شیطان اپنا کام کر گیا۔ محبت کی عمارت ڈنگا گئے لگی۔ دشمنی کی سرنگ
 میں شتابہ لگا، نواب امین الدین خاں صاحب نے منشی کو طلب کیا
 دو ات قلب سیاہ لے کر آئی۔ صفحہ قرطاس نقش محبت سے پاک
 قلم دہن دریدہ روئے سیاہ لئے حاضر ہوئی۔ صفحہ ہستی سے
 حرف محبت مٹ رہا ہے۔ سرکار انگریزی میں درخواست گزاری
 کہ والد مرحوم کی وصیت متروکہ غیر منقولہ کی بابت ہے۔ ترکہ منقولہ
 ہم میں تقسیم کر دیا جائے۔ بنائے محاصرت پڑ گئی دور میسوں میں
 بگڑ گئی۔ فیصلہ امین الدین خاں صاحب کے موافق ہوتا ہے شمس الدین
 خاں صاحب اگرہ میں اپنی کرتے ہیں، ولایت کے قانون کے مطابق
 لوہار بھی بڑے لڑکے نواب شمس الدین خاں صاحب کو مل جاتا ہے
 امین الدین خاں صاحب اور ضیاء الدین خاں صاحب کے حق
 میں ایک ایک ہزار روپیہ گزارہ کا حکم ہوتا ہے،
 نواب امین الدین خاں صاحب کے پاس یہ کون انگریز بیٹھلے
 ادھو۔ فرزیر صاحب ہیں۔ چپکے چپکے باتیں ہو رہی ہیں۔ نواب صاحب

افسردہ خاطر سے بیٹھے ہیں۔ فرزیر کہتا ہے، بھائی امین الدین پریشان نہ ہو۔ اس وقت موقع اچھا ہے۔ کلکتہ کا گورنر میرا دوست ہے۔ تم وہاں اپیل کرو۔ میں سفارشی چٹھی دیتا ہوں کام بن جائے گا۔ پردہ کے پاس یہ کون کھڑا کن سوئیاں لے رہا ہے۔ غضب ہو گیا۔ یہ تو خنجہ بریگ شمس الدین خاں صاحب کا آدمی ہے۔ بھائی کے ہاں ٹوہ لینے کو چھوڑ رکھا ہے۔ پتنگ چھڑی۔ پل کی پل میں نواب شمس الدین خاں صاحب کے ہاں جا پہنچا۔ سارا معاملہ کہہ سنایا۔ نواب صاحب کی خاطر عاظر مکدر ہو گئی۔ ٹہل رہے ہیں۔ چہرہ غصہ سے تہمتا رہا ہے۔

فسادی عنادی یہاں بھی موجود ہیں۔ ایک نے کہا۔ اس فرزیر نے بڑا غضب ڈھا رکھا ہے۔ جب تک یہ ہے جمع خاطر معلوم۔ دوسرا بولا قضا سر رکھیل رہی ہے۔ تیسرے نے کہا، بہنگا ہے، منٹوں میں چٹ پٹ کیا جاسکتا ہے۔ نواب صاحب نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور کریم خاں کو طلب کیا۔ سیاہ فام گرانڈیل جوان ہے، آنکھوں سے تہاری ٹپک رہی ہے۔ چپکے چپکے اس کو کچھ ہدایتیں کیں اور کہا، انبا اور اصل کو ساندنیوں پر ساتھ لے جا۔ وہ آداب کر چلتا ہوا۔ نواب صاحب ایک

غوطہ میں خموش بیٹھے ہیں۔

اندھیری رات ہے اور چاروں طرف سناٹا۔ ایک شخص گھوڑے پر سوار اور دو ساندھنی سوار دلی کے قریب بارے پر دوختوں کی آڑ میں کھڑے ہیں۔ ایک نیچے کا عمل ہے۔ ایک انگریز تین تنہا گھوڑے پر سوار اس طرف چلا جا رہا ہے۔ ساندھنی سواروں نے راستہ روکا، گھوڑے پر جو شخص ہے اس کے ایک ہاتھ تلوار کا دیا۔ انگریز پٹنچہ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتا تھا کہ ایک تلا ہوا ہاتھ اور مارا۔ کام تمام کر دیا۔ بچھاڑ کھا کر گرا، خون کے شرابے بہ گئے۔ تمام زمین لہو لہان ہو گئی۔ انگریز مارا گیا ہے۔ یہ خون رنگ لائے گا

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔ قاتلوں نے اپنا اطمینان کیا کہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ یا ابھی کچھ جان باقی ہے۔ ساندھنی سواروں نے اپنی راہ لی، اصل قاتل نے دلی کا رخ کیا۔ شہر کے دروازے بند ہیں۔ یہ تمام رات باہر پھرتا رہا، صبح دلی دروازہ سے داخل ہو دیلگنج میں نواب صاحب فیروز پور کی کوٹھی میں آیا۔ وہ یہ تو کریم خاں ہے جس کے کچھ روز پہلے ہم نے نواب شمس الدین خاں صاحب کے پاس دیکھا

تھا۔ گھوڑا اصطبل میں باندھ چار پانی پر سستانے کو بیٹ گیا۔
 یہ کس کی نقش سے جسے تمام افسران گھیرے کھڑے ہیں، آپس
 میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ ایک بولانا فرزی صاحب رات کو مارے
 گئے۔ دوسرے نے کہا، راجہ صاحب یلب گڑھ کے ہاں سے دعوت
 کھا کر جارے تھے۔ تیسرا بولانا نقش باؤٹے پر ملی قاتل مفروز ہے۔ لارنس
 صاحب مجسٹریٹ قریب کھڑے زخموں کو دیکھتے ہیں کہ نواب
 فتح الدبیگ تشریف لائے، یہ نواب امین الدین خاں صاحب کے
 قریبی رشتہ دار ہیں بغش دیکھ کر ابدیدہ ہو گئے، کہنے لگے بھائی
 فرزی میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ فیروز پور سے کریم خاں مجھے مارنے کو آیا
 ہوا ہے۔ تو اکیلا اکیلا نہ بھرتے تو نے میری بات نہ مانی اور اپنی جان دی
 یہ بات لارنس صاحب نے سنی اور مجمع میں سے باہر آگئے۔ سیدھے
 نواب صاحب فیروز پور کی کوٹھی پہنچے، قضا عند اللہ، دروازہ پر کریم خاں
 کھڑا ہے، پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا سپاہی۔ کیا نام؟ جواب ملا
 کریم خاں۔ دریافت کیا کہ دہلی کب آیا؟ اس نے جواب دیا کوئی
 دس روز ہوئے، کیوں آیا تھا؟ سرکاری کام کو۔ اصطبل دریافت

کیا۔ اس نے اشارہ سے بتایا۔ وہاں دیکھا تو ایک گھوڑا پسینہ میں
 شرابور کھڑا تھا، کریم خاں سے دریافت کیا تیرا گھوڑا کونسا ہے
 اس نے اسی کی طرف اشارہ کیا۔ کریم خاں گرفتار ہوا

۔ دوسانڈنی سوار مارا مار منزلیں مارتے فیروز پور کی طرف چلے
 جا رہے ہیں، سانڈھنیاں پسینہ پسینہ ہو رہی ہیں پر یہ دبائے لئے
 چلے جاتے ہیں، صبح ہوتے فیروز پور آیا۔

محل کے دروازہ پر پہنچے، اطلاع کروائی کہ واسل حاضر ہے
 فوراً طلبی ہوئی، نواب شمس الدین خاں صاحب مع مصاحبوں کے
 بیٹھے تھے، یہ آداب بجالایا اور کہا، حضور مبارک ہوا انہوں نے کہا، مار
 دیا؟ جواب دیا آپ کے اقبال سے، ارشاد ہوا، شاباش! جا آرام کر
 واصل باہر نکلا ہی تھا کہ ایک مصاحب نے کہا، اس کو مراد تہیکے
 مبادا قبول دے، نواب صاحب نے قدرے توقف کیا۔ پھر
 آواز دی، واصل کو بھیجو، وہ یہ باتیں سن چکا تھا، باہر ہی سے جواب
 دیا، ابھی حاضر ہوا ذرا دنٹنی باندھ آؤں۔ بس اتنا کہتے ہی اونٹنی کی
 پیٹھ پر تھا، بتجارہ کے علاقہ میں جا کر رپورٹ درج کرائی۔

یوسف زنداں میں بے شمس الدین خاں کشمیری دروازہ کے باہر قید
 آج سنگاریوں ہو رہا ہے! کیا رہائی کا حکم آگیا۔ نہیں آج قید ہستی
 سے رہائی ہے۔ نہاد ہو پوشاک پہن عطر مل باہر نکلا، بسم اللہ کہہ کر
 بھانسی کے تختہ پر قدم رکھا۔ بھنگی جو کھڑا تھا اس کو ہٹا دیا۔ اپنے ہاتھ
 سے گلے میں پھنڈا ڈال جاں بحق تسلیم ہوا۔

اہل دربار زار زار رو رہے تھے۔ دلی نے اس نوجوان جانہار
 کو حسرت دیا اس سے دیکھا اور سر پکڑ کر ہو بیٹھی۔ نقیب نے صدر
 مغل لے جا بٹھایا۔

یہ کون جوان گھٹنا پہنے انگرکھا زیب تن کئے ہاتھ میں بانس
 کی کھچیاں لئے چلا آ رہا ہے۔ قادر البیانی، بسیار نویسی بلکہ انبار نویسی
 کتابوں کا پشت تارہ لئے جلو میں حاضر۔ بھاٹ نے آواز دی۔ خواجہ
 امان مترجم بوستان خیال تشریف لاتے ہیں۔

طبیعت اس قدر مصروفیت پسند ہے کہ ہمہ وقت کھچیاں ہاتھ
 میں اور قلم تراش جیب میں رہتا ہے۔ جہاں خالی وقت ملا کھچیاں تراش
 کھڑے اور کانپیں بنانی شروع کر دیں۔ حسب مرتبت جگہ

پائی۔ یہ تھوڑی دیر تو کچھ بے چین سے بیٹھے رہے۔ خالی بیٹھنا ان کی طبیعت کے خلاف اور آداب و ربار مانع۔ آخر کار جب نہ رہ سکے زمین خدمت کو بوسہ دیا اور اجازت چاہی، ان کے جانے پر دربار میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ اور بزمِ خموشاں کی آواز دلی ماتامک پہنچی۔ ماتا جی نے استفسار فرمایا۔ معلوم ہوا کہ آخر شب خواجہ صاحب کے ہاں محفل آراستہ ہوتی ہے اور اہل شہر اس کو بزمِ خموشاں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دلی ماتا بھی بیٹھے بیٹھے اکتا گئیں تھیں، فرمایا آؤ ہم بھی دیکھیں شہر میں کیا ہو رہا ہے، دربار برخواست ہوا جو گن جی چلیوں کو سانس لے چل کھڑی ہوئیں۔ تاجدار مشرق افقِ مغرب میں غروب ہوتا ہے جو گن جی جامع مسجد پہنچتی ہیں۔

پانچ ہزار بندگانِ خدا نے چھ سال کام کیا دس لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ ۱۶۵۷ء میں زیرِ اہتمام سعد اللہ خاں دیوانِ اعلیٰ اور فضل خاں خانِ سامان ۱۰ رشوال کو بن کر تیار ہوئی۔ شاہجہاں کا نقشہ تھا مسجد جہاں نما نام پایا۔ موضع جہاں نما جواب صدر بازار کہلاتا ہے

مصارف مسجد کے واسطے وقف ہوا۔ صحیح النسل سید امامت کو بلائے گئے، آل رسول ہی کو یہ شرف ہو سکتا ہے کہ بادشاہ وقت کی جانب پشت کرے کسی اور کو یہ اقتیا نہیں بخشا جاسکتا اور شاہجہانی نہ رہا۔ اورنگ زیب زیب اورنگ ہوا، نیرنگ روزگار کا آشنا کچ خرامی فلک کینہ پرور کا واقف سر تاجدار جانتا تھا کہ دور مغلیہ ایک نہ ایک دن دور فلک کی نذر ہو جائے گا۔ اس وقت کون ہر اقتدار نہو، اس کا کیا مذہب ہوا اور کیا خیالات، موضع جہاں نما مسجد کے قبضہ میں رہے نہ رہے۔ پھر چراغ بتی کی بھی مشکل ہوگی اور خانہ خدایں اندھیل پڑا رہے گا۔ دور اندیش نے دور کی سوچنی اور مسجد کے گرد تھوڑی تھوڑی زمین چاروں طرف وقف کر دی۔ اس وقت یہاں بازار لگا ہوا ہے جس کو چوک کہتے ہیں۔ عجب چل پل ہے چھیل چھیلے، جوان سچیلے پہلوان، تیکھے بانگے، مصروف سیر ہیں، بدن بنے ہوئے، ڈاڑھیاں چڑھی ہوئیں، مونچھیں نشیخ عسرب، تکیہ چتون، کسرتی بدن، بھیڑ بھاڑ کا یہ حال کہ راستہ چلنے کو راستہ نہیں امیر امراء سوار یوں ہیں، غریب غریبا پیادہ، انگر کے بدن پر کسی نے

نیچے کرتے ہیں رکھا ہے، کسی نے نہیں، بانگوں کی ایک ایک آستین غائب، آڑی ٹوپیاں لگائے چلے جا رہے ہیں۔

ایک طرف نیم حکیم خطرہ جان اپنی دکان سجائے عجب سچ دواج سے بقراط وقت بنے بیٹھے ہیں۔ سامنے دس بیس دواؤں کی تھیلیاں کھلی دھری ہیں اور خود کل امراض کے علاج پر کمر بستہ۔ خدا شکر خورے کو شکر اور موزی کو ٹکر کسی نہ کسی بہانہ دے ہی دیتا ہے، کوئی نہ کوئی اُلٹ پھنستا ہے اور ان کا اُلر سیدھا ہوتا ہے۔ حکیم صاحب دو چار روپیہ بنا لیتے ہیں، انکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا آیا اور انہوں نے چرب زبانی سے کام لیا روغن قاز ملا۔ کچھ علاج الامراض پر تبصرہ فرمایا۔ امراض الابدان کی تشریح کی، گاہک پھنسا یا کام بنایا اور سیدھے ہوئے۔ ہر طرح خدا بھوکا اٹھاتا ہے، بھوکا سلاتا انہیں رگ۔ بھرتا ہے رزق سے رزاق دہن پتھر کے۔

وہ سامنے کو ابی چوٹا سلگا۔ گے کو اب لگائے بیٹھا ہے پیاز کے پٹھے کترے رکھے ہیں۔ چٹ پٹی چٹیاں سلیقہ سے چنی ہوئی ہیں انہوں نے کی رغبت آتی ہے۔ گاہک ہے کہ ٹوٹا پڑتا ہے، دکان دار

کو سراٹھانے کی فرصت نہیں۔ پانچوں گھی میں ہیں، کوئی دوسرے مانگ رہا ہے کوئی چار کے۔ دو چار کھڑے مشورہ کر رہے ہیں کوئی کھائیں کوئی نہیں۔ اغل بفل شاگر د بیٹھے آواز لگا رہے ہیں سننے والوں کے منہ میں پانی بھرا چلا آتا ہے۔ انواع و اقسام کے کواب موجود ہیں۔ تی کے کواب بھی ہیں۔ گولہ کے بھی۔ لونگ چڑے ہیں۔ چڑیا کے بھی۔ پانی کی پھلیاں سیخ کے کواب۔ پھلیاں۔ شامی کواب۔ یہ میاں جانی کوابی ہیں، اس وقت ہندوستان بھر میں ان کا جواب نہیں۔ مصالحہ کا اندازہ کچھ ایسا صحیح ہے کہ ہر شخص کو مزادے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ منہ کو لگے پھر چھٹتے نہیں۔ جو کھاتا ہے انگلیاں چاٹتا ہوا جاتا ہے۔ لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اور روپوں بندوں کے کھاتے ہیں۔ ان کی دکان پر سر شام سے گھاگھی رہتی ہے اور کنداری کا بازار گرم۔ دس بیس کے بیج کراٹھتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو جانداویں کھڑی کر لیتا۔ پر یہاں وہی ڈھاک کے تین پات ہیں۔ جیسے چنارہ دار کواب بناتے ہیں ویسے ہی خود بھی چسکے ہیں، ان کا قول ہے۔

چٹ ڈال مال دہن کو۔ کوڑمی نہ رکھ کفن کو۔ جس نے دیا ہے

تن کو۔ دے گا وہ ہی کفن کو۔ گریا رہے تو عاشق۔

ایک جانب جانوروں کا بازار لگا ہوا ہے، کچھ کابکوں میں بند
ہیں کچھ پنچروں میں۔ بعض جال میں پھنسنے ہیں۔ بعض رشتہ برپا چنڈ
چکور شیرازی کے جوڑے، بلبل ہزار داستان۔ طوطی خوش الحان
چنڈول، الگ، بنگالہ کی مینا، کاکتوا، باز، شہباز، خرم، ااصیل،
مرغ، تیتتر، بٹیر، مرغ شکہ دنیا بھر کا جانور یہاں موجود ہے۔ پڑی
مار۔ شکار پھانس کر لاتے ہیں۔ بڑے بڑے استاد جانوروں کو
بولیاں سکھاتے ہیں، ان کو سدھاتے ہیں۔ شوقین شام کے وقت
چوک پر آتے ہیں۔ دکاندار منہ مانگے دام پاتے ہیں۔ استاد میرن
بھی پھر رہے ہیں، شاہی بلبل ہزار داستان ان کا ہی پڑھایا ہوا ہے
جہاں کوئی اچھا جانور نظر پڑا اور یہ ٹھٹکے۔ جدہران کی نظر پڑی ادھر
ہی گاہک ٹوٹ کر گرا۔ مشت پر شوقین کی نظر چڑھا۔ اور دام چڑھے
دیکھتے وہ چارھیل چھیلے آپس میں چیل کرتے چلے جا رہے
ہیں۔ ذرا سینس ان میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

مرزا۔ جناب گنجہ کے میر صاحب اب کیا خیال ہے۔

میر۔ جناب مرزئی صاحب۔ خیال من ہمہ آن است کا خیال
شما ست۔

خان۔ واہ میر کیا کہنے! یہ مرزئی کی ایک ہی رہی۔ ہم کو ڈر ہے کہیں
کوئی شوقین ان کو مرزئی سمجھ کر زیب بر نہ کرے۔

مرزا۔ اچھا خاں صاحب بھی چرکے۔ خیر سے ابھی سن و سال ہی کیا
ہے۔ جو بر کی پڑ گئی۔ پھر کیف رجحان طبع معلوم ہو گیا۔ انشاء اللہ
جلد کوئی شکل نکالی جائے گی۔

شیخ۔ معاف کیجے گا جناب کی گفت گو، کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آئی
مرزا۔ بندہ نوازیہ دلی والوں کی باتیں کچھ دلی والے ہی بہتر سمجھتے ہیں
جناب ان کو سمجھنے کی کوشش نہ فرمائیں تو بہتر۔ اب یہ بتائیے
کہ ارادہ کیا ہے۔

شیخ صاحب ہمارا کیا ارادہ۔ یہاں تو سپرد دم بتو کا معاملہ ہے۔
رشتہ در گردنم افگندہ دوست

می بردہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مرزا۔ بھی میرا اب ہنسی مذاق تو جلنے دو، ہماری مانو تو کہیں چل کر

گانا سنو۔

میر۔ ہماری صا د ہے۔

خان۔ اور ہماری بھی۔

شیخ۔ کس کا گانا سننے کا صاحب

خان۔ بندہ نواز کسی طوائف کا سین گے۔

شیخ۔ کیا دلی ولے طوائفوں کا گانا سنتے ہیں۔

میر۔ بیشک۔ کیا جناب کے شہر کے شرفا و اعظ کا وعظ سن سن کر

زندگی کے دن گزارتے ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ اعتراض مد نظر

نہیں ہے۔ ہر شہرے و ہر رسمے، اپنا اپنا شوق ہے۔ ہم

ارباب نشاط سے دل بہلاتے ہیں، آپ واعظ و زاہد سے۔

تجھ کو مسجد ہے مجھ کو مے خانہ

زاہدا اپنی اپنی قسمت ہے

شیخ۔ یہ گناہ بھی تو ہے۔

میر۔ بندہ پرور کیا گناہ ہے اور کیا ثواب یہ ایک طویل بحث ہے

ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ جہنم کی رندلیوں اور پیدائشی یتیموں کی مدت

اگر ثواب نہیں تو گناہ بھی نہیں ہو سکتی
شیخ۔ کیا درحقیقت آپ ایسا سمجھتے ہیں۔

میر۔ صاحب یہ عالم مجاز ہے۔ یہاں حقیقت کا کیا کام۔ یہ سب
باتیں برسبیل گفتگو نہیں ورنہ اصل معاملہ تو یہ ہے کہ وہ
جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد۔

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

خان۔ آئیے آج تو اس کو ٹھے پر چلیں دیکھیں کیا رنگ ہے۔

چاروں یار زینہ پر چڑھنے شروع ہوئے۔ شیخ صاحب سب
کے پیچھے کئی بجائے چلے آ رہے ہیں۔ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے ہیں۔ اندیشہ
ہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ مرزا صاحب، خاں صاحب اور میر صاحب
تو درانہ اندر چلے گئے، یہ بیچارے ذرا چوکھٹ پر ٹھٹھکے خان صاحب
نے ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹا اور کہا بھی عجیب تماشاں کے آدمی ہو، یہاں
کوئی ہوا بیٹھا ہے جو تم کو کھا جائے گا۔ ڈرتے کیوں ہو۔ لو دیکھو۔ یہ
پری چھم برق دم تہارے استقبال کو سرو قد کھڑی ہیں۔

طوائف کا سنی رنگ کی، زریفت کا آڑا پایا جامہ پہنے ہم رنگ

کرتے دوپٹہ پہنے اوٹھے ٹانگ پر ٹانگ رکھے نہایت ٹھسے سے بیٹھی تھی، ان کو دیکھ کر کھڑی ہوئی اور ایک ادلے خاص سے آداب بجالائی، یہ سب گاؤں کیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب خاں صاحب اور میر صاحب تو کہنہ مشوق تھے، آرام سے جا بیٹھے، ہمارے شیخ جی کچھ بچھے بچھے سے ان تینوں کی اعراب میں بیٹھے ہیں طوائف نے چاندی کی تھالی میں پان پیش کئے، میر صاحب نے نام دریافت کیا۔

طوائف۔ اس ناچیز کو مشتری کہتے ہیں۔

میر۔ اوہو آپ ہی وہ مشتری ہیں جن کی مانگ کہکشاں اور بال سنبلا ہیں۔

مشتری۔ سرکار تو آسمان کے تارے توڑتے ہیں۔ فلک الافلاک کی خبر لاتے ہیں۔

مرزا۔ مشتری جان! ہمارے میر صاحب فلک سیر کا شوق فرماتے ہیں مشتری۔ ماشار اللہ! جہی تو دماغ آسمان پر رہتا ہے۔

لہ ایک مجون کا نام ہے۔

مرزا۔ اور زہرا جبینوں کے دلدادہ ہیں۔
 مشتری۔ حضور! یہ زہرہ کی چاہ اچھی نہیں، کہیں چہر بابل نہ جھانکنی پڑے۔
 میر۔ زہے نصیب۔ اس دن کا تو انتظار ہے۔

مشتری۔ آخر یہ کیوں۔
 میر۔ بات یہ ہے کہ ہماری قسمت روزِ ازل سے اُلٹی ہے۔ جب
 ہاروت ماروت کی طرح ہم اُلٹے لٹکائے جاتیں گے۔ تو
 قسمت سیدھی ہو جائے گی،

مشتری واہ حضور کیا کہنے۔ خدا کی قسم کیا بات پیدا کی ہے۔ جناب
 دلی والے ہیں۔

میر۔ بیشک۔

مشتری جی بھی تو۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر جو گن جی بھی حضرت سرمد شہید
 رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ مبارک پر حاضری دیتی ہوئی پائے والوں
 کی طرف سے خراماں خراماں اسی کوٹھے کے تیچے آن پہنچیں۔ اور
 ذرا ٹھٹکیں۔ مصاحبین اداس شناس تاڑ گئے۔ کہ طبیعت سیرِ عالم

رنگ و بو کی طرف مائل ہے۔ سب کے سب جلو میں دست بستہ
 دم بخود کھڑے ہیں، دلی ماتا اس سکوت کے معنی سمجھ گئیں۔ خادمان
 حلقہ بگوش کی جانب دیکھا اور فرمایا، جب جو گیا بھبھوت لیا تو پھر جہاں
 جی چاہا بیٹھ گئے، کچھ امتیاز جاہ و جلال باقی نہیں رہتا۔ اُو ذرا گانا سنیں
 آگے آگے جو گن جی، پیچھے پیچھے چیلے، بی مشتری کے کوٹھے پر جا پہنچے،
 یہاں برآمدہ میں استاد ساز ملارہے ہیں۔ ایک کونے میں بی ناگہ جان
 بیٹھی پان لگا رہی ہیں۔ ہمارے رنگیلے دوست بیٹھے خوش گپیاں
 کر رہے ہیں۔ جو گن جی اور ان کے ساتھیوں کو آتا دیکھ کر سب
 قرینہ قرینہ سے ہمو گئے۔ بی مشتری نے مجرمی عرض کیا۔ اور پھر
 سکڑ سکڑا کر ہو بیٹھیں۔ تمام ارباب محفل کو پان پیش کئے گئے۔ اتنے
 میں لکڑ والا، حقہ لے آیا۔ دو دو دم سب نے لگائے دماغ طبلہ عطار
 بن گیا۔ خمیو کی خوشبو سے سارا کوٹھا مہک اٹھا۔ اپنی قسمت کا لے
 دعائیں دیتا چلا گیا۔ اتنے میں استاد اپنا ساز و سامان لے کر ان پہنچے
 پہلے سب کو جھک جھک کر آداب بجالائے۔ پھر بیٹھ گئے۔ بائی جی ان کے
 آگے بدن کو دوپٹہ میں چھپائے۔ آنچل پیروں میں دبائے

تشریف فرما ہوئیں۔ پہلے خیال پٹہ شروع ہوا۔ پھر غزل اور ٹھمری کی نوبت آئی۔ ریڈی کا کوٹھا کبوتر باز کی چھتری ہے۔ بھات بھات کا آدمی آتا ہے۔ ابھی گائے بجانے کا سلسلہ جاری تھا کہ تین چار درآن دھکے ان میں آگے ایک صاحب ہیں۔ پستہ قامت سانولارنگ، شوخ حتم ان کو دیکھ کر مشتری نے تبسم زیر لب کیا۔ اور استاد کہہ کر مہرے بجالاتی، انہوں نے بھی ایک انداز خاص سے اس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر ہو بیٹھے، دو چار چیزیں سنیں۔ مشتری سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ چہ می گوئیاں ہوئیں اور یہ چلتے ہوئے مشتری نے کہا بھی، استاد کچھ دیر تو تشریف رکھئے، ایسی بھی کیا جلدی ہے، یہ بولے بی صاحبہ بات یہ ہے کہ ہماری زبان میں ہو رہی ہے چل۔ اور یہ لٹو سلو ماننے کی نہیں۔ بس ہمیں جانے ہی دو، طوائف نے اٹھ کر آداب عرض کیا اور کہا کل آئے گا۔ یہ بولے، کیوں نہیں تم ہم کو تو گردان سمجھو۔ پر یہ بتاؤ۔ تم آج شربت کا سنی کیوں بنی بیٹھی ہو مشتری۔ میں ہوں بھی تو دوائے درد جگر اُستاد۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ کوئی جاہنہار گھول کر نہ پی جائے۔

مشتری۔ ادھر بڑے گھوں کر پینے ولے۔

استاد تم جانو۔

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار

اب مان نہ مان تو ہے مختار

استاد تو یہ کہہ کر چلے گئے، دلی ماتا نے ان کی بابت دریافت کیا کہ یہ کون تھے۔ ہمارا ہیوں میں سے ایک نے عرض کی، سرکار یہ استاد محمد بیگ ہیں۔ بے پناہ بن اوت جانتے ہیں، نہایت چابک دست چابک سوار ہیں۔ ضلع۔ جگت پھبتی اور حاضر جوابی ہیں ان کا جواب نہیں۔ ہولی دیوالی کی کفر کچھریوں میں ان کا ڈنکا بجتا تھا پھکڑ باز ان کو استاد مانتے ہیں۔ سوینا بیگ خاں کے کمرہ پران کا کمرہ ہے۔ وہاں روز محفل آراستہ ہوتی ہے۔ شہر بھر کا تیز طر آشوب گفناں جمع ہوتا ہے، اکثر زبان دراز دور دور سے مقابلہ کے لئے آتے ہیں، استاد کی سب سے چھوٹ ہوتی ہے۔ جو منہ آتا ہے۔ منہ کی کھاتا ہے۔ غلام ایک نہ ایک ایسا فقرہ چیت کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منہ زور منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جواب بن نہیں پڑتا۔ اپنا سامنہ لیکر چلا

جاتا ہے، استاد چلتے چلتے فقرہ کستا ہے، دیکھنا جیسے پیٹھ دکھائی
 ویسے منہ بھی دکھانا۔ پھر بھی آنا۔ جو ایک دفعہ مقابلہ پر آجاتا ہے۔ اس کا
 پھر منہ نہیں پڑتا کہ منہ دکھائے، استاد ایسا منہ توڑ دندان شکن فقرہ
 کہتا ہے کہ منہ پھیر دیتا ہے۔

والی بھوپال سکندر جہاں بیگم صاحبہ نے جب بھوپال کو راستہ
 کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے وزیر جمال الدین اسم باسمی نے ہر گلشن سے
 پودا لاکر لگایا۔ دلی کی پودا اس وقت تکے دھڑی بک رہی تھی، یہاں سے
 استاد محمد بیگ کو لے گئے، انہوں نے جانے سے پہلے قول لے لیا
 کہ میرے قول اور فعل پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہوگی۔ کچھ عرصہ وہاں
 رہے پر طبیعت کا غنیمت کمانے لگا۔ ہم صفیران چین کی یاد ستانے لگی
 اس باغ کے بلبل وضع دار بھی ہیں و فادار بھی۔ یہاں کی بہار لٹ
 چلی تھی، باغ اُجڑ چکا تھا پر کیا کرتے، ان کو اس مٹی سے محبت تھی۔
 نوکری چھوڑ چلے آئے، اب بھی ان کے فزردان موجود ہیں۔ برے
 بھلے حالوں گذر ہو ہی جاتی ہے۔

اس وقت بھی ان کے کمرہ پر شہر بھر کا پھکر جمع ہو گا اور فقرہ بازی

کی محفل آراستہ۔ یہ سن کر دلی ماتائے کہا، اوہم بھی اُستاد کے
 کمرہ پر چلیں۔ ساتھی ہکا بکا رہ گئے۔ اب بغلیں جھانک رہے ہیں۔
 ایک دوسرے کی طرف دیکھتا ہے اور دم بخود ہے۔ دلی ماتا یہ
 کیفیت دیکھ کر بولیں، آپ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ یا سکتہ ہو گیا
 یہ ایک دم سکوت کیوں۔ سب چپ ہیں، بولے تو کون بولے
 ایک درباری نے زمین خدمت کو بوسہ دیا، کمر اطاعت پر دست
 التجار کھے اور عرض کی، گوش گذار بارگاہِ خداوندی کرنا چاہتا ہوں
 کہ وہ مقام قابلِ قدم مہینت لزوم نہیں۔ یہ سن کر دلی ماتا
 مگر ہو گئیں اور چہرہ پر غم و غصہ کے آثار نمودار۔ اپنے ساتھیوں
 کی طرف دیکھا اور فرمایا، نیند کے ماتو۔ مصیبتوں اور ذلتوں کا
 آفتاب سر پر آن پہنچا اور ابھی تک تم عیش و عشرت کی نیند سو
 رہے ہو۔ عزت و جلال کے خوشگوار خواب دیکھ رہے ہو۔ یہ آنکھیں
 جو ایک نگاہ میں دنیا کو نہال کر دیتی تھیں، نو نہالوں کو رو چکیں،
 یہ ہاتھ جو مہن برساتے تھے، اپنوں کو ڈھوتے ڈھوتے شل ہو گئے
 سر جوڑا نوبے یار اور گل تکیوں پر رہتا تھا، بارہوش کا نسا کھٹکتا

ہے۔ یہ سینہ جو خوشی و غری کا خزانہ تھا آج حسرت و حرمان کا دھیندہ ہے اور تم ہو کہ وہی داستان پارینہ لئے بیٹھے ہو۔ یہ مقام درخورِ قدمِ مہینیتِ لزوم ہے اور یہ نہیں۔ رسی جل گئی پر مل نہ گیا۔ ریاست خاک میں مل گئی، بوبے ریاست ابھی باقی ہے۔ جاؤ ہمارا تمہارا ساتھ نہیں۔ ماما جی اتنا کہہ کر چل کھڑی ہوئیں اور یہ سب کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ جب ان کے بغیر نہ رہ سکے تو پیچھے پیچھے ہوئے۔ پر کچھ فاصلہ سے۔ تھوڑی دور جا کر دلی نے مڑ کر دیکھا تو سب جاں نثار جان کے ساتھ دیکھے۔ قریب بلایا اور کہا۔ ہم اپنے دن گزار رہے ہیں۔ اپنا وقت پورا کر رہے ہیں۔ ادھر ادھر اٹھ بیٹھ کر غم غلط کرتے ہیں۔ ہم تم کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ آؤ ہمارے ساتھ آؤ۔ آئندہ احتیاط رہے۔ احسان مندوں نے قدم چوم لئے۔ تھوڑی دیر میں دینہ بیگ خاں کا کمرہ آیا۔ اور یہ سب استاد محمد بیگ کے کمرہ پر جا پہنچے۔

زمانہ بھر کے آزاد منش۔ تیز طبع حاضر جواب جمع ہیں۔ زبان درازی۔ فقرہ بازی کا بازار گرم۔ ہر ایک کی زبان تیز طرار۔ تیغ بڑاں خنجر آبدار۔ آداب محفل نزلے ہیں۔ اس بزم کے انوکھے آنے

ولے ہیں۔ دعا سلام کا نام نہیں، تہذیب کا یہاں کام نہیں، نہ آداب
 اخلاق سے سروکار۔ نہ منغلاط سے ان کو عار۔ آزاد ہیں پابند
 نہیں، ان کے قول و فعل پر کوئی قید و بند نہیں، جو منہ میں آتا ہے
 سو کہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے۔ کہ فقرہ چست ہو بندش درست
 الفاظ چھتے ہوئے، جواب کھتا ہوا برجستہ۔ ایک طرف آزاد منش
 رند مشرب بیٹھے ہیں۔ ایک طرف مست مولا مستان۔ اس محفل
 میں امتیاز مراتب نہیں۔ امیر بھی ہیں، غریب بھی، فقیر بھی
 ہیں۔ رئیس بھی۔ سب ایک حمام میں ہیں۔ اور ایک رنگ میں
 میدان، تمسخر میں سمند زبان گام زن ہے، ضلع جگت پھبتی کی
 جولان گاہ میں کلیلیں کرتا پھرتا ہے۔ کسی نے فقرہ کسا اور سمنداز
 پرتاز یا نہ ہوا۔ ترارا بھرا آسمان کے تارے توڑ لایا۔ ایسا جواب دیا
 کہ سب لاجواب ہو گئے، محفل سے تحسین و آفریں کا غلغلہ آسمان
 تک پہنچا۔ ساکنانِ کرہ خاک کی داد فلک الافلاک پر فرشتوں نے
 دی۔ محفل جماؤ پر تھی کہ ایک صاحب کالے کلوٹے، موٹے
 تازے، سفید پوش تشریف لائے۔ اہل محفل ان کی طرف دیکھنے

لگے۔ نووارد سے معلوم ہوتے ہیں، استاد نے دریافت کیا۔
استاد۔ اسم گرامی؟

نوارد۔ نام سے آپ کو کیا کام۔ جس کو زبان درازی کا دعویٰ ہو،
مجھ سے زبان ملائے۔ مقابلے میں آئے۔

استاد۔ ابھی تو آپ آئے ہیں قابلہ کا بھی انتظام ہو جائے گا
نوارد۔ بھوکے تھے نہ، میم کھا گئے۔

استاد۔ میم کے معنی نہیں ہیں اور نہیں کا یہاں کام نہیں۔
اس نہیں کا کہیں جواب نہیں

روز کہتے ہو تم کہ آج نہیں

نوارد۔ معلوم ہوتا ہے شہر میں غلہ ہنگا ہے۔

استاد۔ جی ہاں۔ باہر کے گدھے اگر سب چر گئے۔ پر جناب کچھ فرود کریں
آپ کے راتب کا معقول انتظام ہو جائے گا۔

نوارد۔ آپ کسی اصطبل میں بھی بندھے ہیں یا نہیں۔

استاد۔ شاید جناب کھونٹا تڑا کر بھاگے ہیں جو نام نہیں بتاتے۔

نوارد۔ تم بڑے منہ زور ہو۔ کوئی اگاڑی پچھاڑی نہ ڈال دے۔

استاد۔ یہ دلی ہے جو کسی نے سواری گانٹھ لی تو ٹھوکریں کھاتے پھرو گے
 نووارو۔ ایسا تو میں بھی مینا نہیں ہوں۔ مجھے ڈر ہے۔ کوئی تمہاری
 مشکیں نہ کس لے، کبھی طویلہ کی بلا بندر کے سر جائے۔

استاد۔ پسینے کیوں ہونے لگے، خدانخواستہ تم نوخوید میں اترے ہوئے
 ہو۔ پر تم جیسے اللہ بچھیرے بہت سے کھڑکھڑیہ میں جوت
 سدہ کر دینے۔

نووارو۔ کوئی تمہارے مضمتہ نہ لے ڈالے۔

استاد۔ ہمیں تو تھان کے ٹرے معلوم ہوتے ہو۔ یہاں تو کچھ چوڑی
 سی بھولے ہوئے ہوا ابھی نام تک تو تم نے بتایا نہیں، ایسے
 کھوئے گئے کہ نام بھی بھول گئے۔

نووارو۔ ایسا بھولا نہیں ہوں کہ نام بھول جاؤں۔ آپ جیسے دس بیس
 کو چرا کر چھوڑ دوں۔ میرا نام ہے شرافت۔
 اہل محفل میں سے ایک۔ برعکس نہند نام زنگی کا فور۔

نووارو۔ اسی وجہ سے میں نام نہ بتاتا تھا۔ یہ نام اس بزم خرافات
 کے قابل نہیں۔

استاد۔ چہ خوش چرا بناشد نام والا تو محفل میں آگیا۔ پر نام نہ آنے
پائے۔ گڑ کھائیں گنگلوں سے پرہیز

نوارو۔ جناب کو گڑ۔ اناج اور غلہ وغیرہ سے بہت دلچسپی ہے۔
معلوم ہوتا ہے کسی بقال کی نسل سے ہیں۔

استاد۔ اور آپ کسی بقال کی نسل سے ہیں۔ سلسلے دونوں ایک ہیں
ذرا نقطہ کا ال بل ہے۔ سو عاقلان در پئے نقطہ غنی روند۔ اور

جناب شہر آفت صاحب جہاں تک نام کا سوال ہے۔ یہ

آپ کے لئے اختراع کیا گیا ہے اور آپ اسی نام کے لئے پیدا ہوئے ہیں،
اہل محفل۔ وہ کیوں۔

استاد۔ آپ لوگ سمجھتے نہیں، یہ جو بزرگ آپ کے روبرو بیٹھے ہیں
فی الحقیقت شراد آفت کا میل ہیں۔

نوارو۔ بس میل جوں کی باتیں رہنے دیجئے، اب آپ کئی کاٹتے ہیں،
استاد۔ کئی نہیں کاٹنا۔ حضور میری مقرض زبان سلامت چاہئے۔

تھان کے تھان پھاڑ ڈالوں گا۔ آپ ہیں کس ہوا ہیں۔

نوارو۔ آپ تو خالی ہوا باندھتے ہیں۔ چلتی ہوا سے لڑتے ہیں۔

استاد۔ یہ جناب کا خیال خام ہے۔ یہ خادم قوآپ کے خاندان کا دیرینہ
تہوا خواہ ہے حتیٰ کہ آپ کا نام بھی اسی ناچیز ہی نے رکھا تھا۔

اہل محفل۔ استاد آپ نے ان کا نام کیونکر رکھا تھا،

استاد۔ صاحب آپ لوگ نہیں جانتے جس طرح۔ شر۔ آفت صاحب

سانولے سلونے، ماشاء اللہ کان نمک ہیں اسی طرح ان کے

نام میں بھی صنعت تبلیغ ہے۔ جناب کا اسم گرامی قصہ طلب

شعر ہے۔

نوار۔ ع دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز۔

استاد۔ دور سے بیٹھے آنکھیں دکھا رہے ہو۔ خامے گاؤ دید گاؤں

معلوم ہوتے ہو۔ زبان ملاؤ تو بتاؤں۔

اہل محفل۔ استاد ہم سب مشتاق ہیں ذرا وہ نام رکھنے کا قصہ سنا دیجئے

استاد۔ صاحبان ایک عرصہ کی بات ہے۔ مدتیں گزریں۔ زمانہ ہو گیا۔

ہماری جوانی تھی۔ پاؤں پڑنگل سوار تھا ہر پہنچ۔ دل میں آئی

کہ چلو ہم بھی جہاں گشت بنیں۔ سیر دانی الارض پر عمل کریں

ذرا دنیا دیکھیں۔ سامان سفر تیار کر چل کھڑے ہوئے۔ نہ سہ

بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی۔ نکل گھر سے راہ سیدھی جنگل کی لی۔ چلا چل چلا چل، راہ کی عمر کوتاہ اور چلنے والے کی عمر دراز، ایک مقام پر پہنچے کہ نام تھا اس کا وحشی نگر۔ بانگر پور تعلقہ جہالت آباد۔ شہر میں قدم رکھتے ہی دماغ بوئے جہالت سے پر اگندہ ہو گیا۔ لوگ گندہ دہن۔ کم رو۔ چھوٹے چھوٹے سر۔ حماقت مآب، جانگلو۔ احمق۔ خریا متخص۔ طبیعت تو وہاں پہل بھی ٹھیرتا گوارا نہ کرتی تھی۔ پر کیا کرتا۔ نہ جائے ماذن نہ پائے رفتن۔ آفتاب سر بام تھا جھپٹتا ہو چلا تھا۔ رات سر پر آ رہی تھی۔ ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مرا ہے۔ تو عجب اولے استغنا سے فرماتے ہیں، ہم تو گھر میں رہتے ہیں۔ میں نے عرض کی، خدا آپ کو گھر میں رہنا مبارک کرے، میں مسافر ہوں، تو ارشاد ہوا، جمعرات کو آنا۔ قسیمہ آگ ہی تو لگ گئی، دل میں آیا اتنا جتیاؤں کہ ساری عمر یاد کرے اجنبی جگہ سمجھ کر چپ ہو گیا۔ دل میں ٹھان لی، یا قسمت یا نصیب ہر ملے چاہے نہ ملے، اب کسی سے پوچھوں گا نہیں۔ تھوڑی

دور گیا تھا۔ مقدّر سامنے تھا۔ سامنے سرا دکھائی دی۔ شکر باری تعالیٰ
 بجالایا اور سیدھا بی بھٹیاری کے پاس گیا۔ کالی کلوٹی بیگن لوٹی
 خنکری سی ایک عورت میلے دسمال کے رنگ کے کپڑے پہنے
 چولہے کے آگے بیٹھی روٹی پکا رہی تھی، ماتھے پر سے پسینہ بہ رہا تھا۔
 یقین مانے وہ بھی کالا۔ گلوڑی منہ میں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ڈائن
 ابھی ابھی کسی کا کلیجہ کھا کر آئی ہے۔ دل میں سوچا اگر مسافر کہتا ہوں تو
 یہ نیک نجت بھی جمعرات کی دعوت دیتی ہے۔ چھٹتے ہی کہا، بی بھٹیاری
 ہم کو کمرہ چاہیے۔ فرمایا کمرہ تو ہمارے پاس کوئی نہیں ہے۔ میں نے
 کہا یہ سرا ہے نہ۔ بولیں۔ جی سرا تو یہی باجے ہے، میں نے کہا رات
 کی رات گزارنی چاہتے ہیں۔ یہاں کہیں ٹکے کو ٹھکانا ہے۔ بولیں
 ٹھکانا کیوں نہیں جی، سناری پوری سرائے حاضر ہے۔ مل کمرہ ہمارے
 پاس نہیں ہے۔ میں نے کہا کمرہ نہیں ہے تو پھر تمہارے پاس ہے کیا
 بولیں۔ جی ہمارے پاس کٹھریاں ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا، ان کے پیچھے
 پیچھے کٹھریاں میں گیا۔ پھونس کی چھت، کچی دیواریں۔ چاروں طرف سے
 بواٹھ رہی۔ اس وقت وہ بھی غنیمت تھی۔ سوچنا ایک رات کا

تو واسطہ ہی ہے۔ کسی نہ کسی طرح گزار ہی دیں گے۔ میں نے کہا بی
 بھٹیاری ایک پنگ بھوادو۔ بولیں جی پنگ تو ہمارے ہاں
 کوئی نہیں، یہ سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی،
 سوچا کہ رات کو زمین پر پڑنا پڑے گا۔ سانپ بچھو، کیرے پتنگے
 کا ڈر۔ اب میں کھڑا بی بھٹیاری کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ دل میں
 سوچتا ہوں کہ یہ اچھی سراسہ ہے۔ جہاں پنگ نہ پیرا۔ آخر مہر سکوت
 توڑی اور بولا، کیوں بی تمہارے دیس میں سب زمین پر سوتے
 ہیں؟ یہ سن کر بی بھٹیاری بہت بگڑیں۔ اور تیکھی ادا سے بولیں
 اے نوج دور پار زمین پر کیوں سوتے لگے۔ ادھر کھٹیا کا رواج
 ہے۔ سوسب کھٹیوں پر سوتے ہیں۔ یہ سن کر جان میں جان آئی
 اور کہا ہم کو ایک کھٹیا بھیج دو۔ بی بھٹیاری نے اپنا راستہ بیا۔
 اور ہم چوکھٹ پر ہو بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں ایک مرد سیاہ روپنا
 کا دیو کھاٹے کرایا اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں بچھا۔ یہ جا
 وہ جا۔ قمر ویش برجان درویش۔ میں بشر کر پڑ رہا، اب بھوک
 لگی طبیعت نہ چاہے کہ اس گندی کلونی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاؤں۔

پر بھوک بری بلا ہے۔ پیٹ کا پٹن بیٹنا ضروری تھا جب تقاضہ شدید ہوا اور انتڑیاں قل ہولتھ پڑنے لگیں تو ہم اٹھے اور بی بیٹیا کے دربار میں پھر حاضر ہوئے، اور کہا ہم کو کھانا دو، بولیں کھانا تو ہمارے ہاں ہے نہیں، بھائیو میرا تو سانس رک گیا۔ سوچا کہ آج فاتحہ سے پڑنا پڑا۔ خیر، جو کچھ خدا دکھائے سولا چار دیکھنا۔ نہایت حسرت سے میں نے بھٹیاری کی طرف دیکھا اور کہا 'واہ بی بیٹیا ری تمہاری سرائیں اور مسافر بھوکا سوئے، بولیں' اللہ نہ کرے آپ کے دشمن بیری بھوکے سوئیں۔ ہمارے ہاں کھانا نہیں ہے، جو دال روٹی حاضر ہے ابھی بھجتی ہوں۔ میں نے پوچھا، کیوں بی بیہاں کہیں حلوائی کی دکان بھی ہے، بولیں کیوں نہیں۔ سرائے کے سامنے مٹھن حلوائی کی دکان ہے۔ وہاں ہمہ نیا مت موجود ہے، میں نے سوچا شکریہ ایک بات کا جواب تو اس نیک نجت نے ہاں میں دیا۔ دل میں خوش کہ کچھ مٹھائی لے لیں گے، کچھ یہاں کی دال روٹی ہوگی، کام چل ہی جائے گا۔ سرائے کے باہر آیا۔ سامنے لالہ حلوائی میلی چکٹ دھوتی باندھے ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ایک پٹرے

پر بیٹھے ہیں۔ چاروں طرف تھاں رکھے ہیں۔ پر کفِ مفلس کی طرح خالی۔ میں نے سوچا مکھی جھنگے خاک دھول سے سچانے کو مٹھائی اندر الماریوں میں رکھ دی ہوگی۔ ان سے پوچھا لالہ جی تمہارے پاس کیا کیا مٹھائی ہے۔ بولے بھگوان کی کرپا سے سب کچھ ہے آپ کو کیا چاہئے، حکم کیجئے۔ میں نے کہا ایک آدھ سیر گلاب جامنیں دیدو۔ بولے ”جی گلاب جامنیں تو ہیں نہیں۔ میں نے کہا، اچھا تو امرتیاں تول دو“ بولے سرکار امرتیاں بھی نہیں ہیں، دل میں سوچا کہ یہ چیزیں شہروں میں بتی ہیں۔ یہاں ان کا گاہک کہاں ایسی چیز لے جو گاؤں گنویں میں بھی بتی ہو۔ میں بولا، اچھا ایک پادسیر موٹی چور کے لڈو اور پاؤ بھر بڑی دیدو، انہوں نے بہت عاجزی سے کہا، جی یہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے، میں نے کہا تو پھر لالہ جی آپ کے پاس ہے کیا، بولے آپ کی کرپا سے سب کچھ ہے، میں نے کہا، اچھا جی جو تمہارے پاس ہو وہ ہی دیدو، لالہ بہت ٹھٹھے سے اٹھے، اندر گئے۔ اور ایک گڑا کی بھیلی اٹھا لائے۔ بولے جی ہمارے پاس سب مٹھائیوں کا باوا

ہے۔ ہے لیجئے، یہ دیکھ کر ایک پانچ سیر کی بھیلی سامنے رکھ دی اور بولے: 'کہتا تو لوں، میں نے کہا، بس معاف رکھئے، مجھے نہیں چاہئے، واپس سر میں آیا۔ اپنے کمرہ میں پہنچا تو وہی کالا بھنگ جو کھاٹ لیکر آیا تھا ایک طشتری میں دال اور ایک میں روٹیاں لئے کھڑا ہے۔ دونوں رکابیاں اس سے لیں اور صبر شکر کر کے کھانے بیٹھا۔ روٹیاں بالکل گند دڑے نہ کائے کٹیں نہ مارے مریں۔ ہر نوالہ توڑنا روٹی سے لٹم لٹھا کر نہ تھا، پر یہ پیٹ سب کچھ کرواتا ہے۔ دوسری رکابی کو دیکھا تو اس میں دال۔ دال کیا، بس سنوت پانی مور کا آسنو۔ رکابی کی تہ تک دیکھ ڈالا۔ کہیں دال کا دانہ نہ ملا۔ بھائیو بھوک میں کواڑ بھی پاڑے ہوئے ہیں، وہ روٹیاں اس دال کے پانی سے زہر مار لیں اور کھاٹ پر پڑ رہا۔

بیٹا ہی تھا کہ چاروں طرف سے مجھ حملہ آور ہوئے۔ والد اعلم یہ میرے خون کے کب سے پیاسے اس دن کی تاک میں بیٹھے تھے کہ میں غریب الوطن بے یار و مددگار ان کو ملوں اور یہ میرا لہو پی جائیں، جب ان کے کچوکے کھاتے کھاتے میرا بدن چھلنی ہو گیا تو چارو

ناچار اٹھا، بستر کھولا، ایک سفید چادر نکالی، ایک سرپروں تلے
 دبایا۔ دوسرا سر کے تیچے، چاروں طرف سے اچھی طرح اس میں
 اپنے آپ کو ملفوف کر لیٹ گیا۔ تکیہ پر سر رکھا ہی تھا کہ ایک
 گڑ گڑاہٹ کی آواز آئی۔ میں کلمہ پڑھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھا شاید
 بھونچال ہے۔ کمرہ سے باہر آیا تو دیکھا سر میں سب پڑے سارے
 ہیں۔ خیر خدا کا نام لے پھر اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو وہی آواز بجنبہ
 موجود ہے۔ دل میں ڈرا کہ خدایا اس کمرہ میں کوئی جن ہے یا بھوت
 جو ایسی قیامت خیز آواز نکال رہا ہے۔ یار و زور دست خیز آہنچا۔
 اور صور پھونکا جا رہا ہے عقل نے کہا، پاگل ہوا ہے۔ اس آواز
 سے تو مردے تک جاگ اٹھیں گے۔ اور یہاں تو زندے پڑے
 سو رہے ہیں۔ کروٹ بھی نہیں لیتے۔ یہ صور تو کسی صورت
 نہیں ہو سکتا۔ دل نے کہا، تیرے کمرہ میں کوئی اثر دھا بند ہے
 اور یہ آواز اس کے سانس کی ہے۔ کچھ خون تو مچھروں کی نذر
 ہو چکا تھا، رہا سہا اس خیال نے خشک کر دیا۔ کمرہ سے باہر آیا
 اپنے گرد یا سین شریف کا حصار کیا۔ اب لگاؤ تنہا سر کی انگنائی

میں کھڑا ہوں اور کمرہ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں
 سب آرام سے پیر پھیلائے سو رہے ہیں۔ اور میں فلک زدہ
 زیر سا کھڑا تارے گن رہا ہوں۔ جب کھڑے کھڑے پیروں میں
 خون اتر آیا تو سوچا کہ ساری رات تو اس طرح کھڑا رہنا محال ہے
 کوٹھری میں ریاسلائی جلا کر دیکھ تو ہسی آخر ماجرا کیا ہے۔ دل کڑا
 کر کے کوٹھری کی طرف بڑھا۔ پیر زمین پکڑے بیٹے ہیں۔ ایک
 قدم آگے چلنے سے گریز پا ہیں۔ دل نے کہا چل بھی۔ ایسا بھی کیا ہے
 ایک دن مرنا ہے۔ وقت سے پہلے انہیں سکتی۔ اور جو
 تیری یونہی لکھی ہے تو ٹل نہیں سکتی۔ یہاں اگر کسی نے دیکھ لیا چور
 سمجھ کر دھوا لیا تو کوئی ضمانتی بھی نہیں ملے گا۔ چوکھٹ پر پیر رکھنا تھا کہ
 وہی آواز پھرائی اور میں پچھلے پیروں بھاگا۔ پاؤں کی آہٹ پا کر
 ایک صاحب نے آوار دی، کون ہے یہ، میں چپ چاپ پھرتی
 کوٹھری کی طرف بڑھا، اب کے دل میں ٹھان لی کہ چاہے جان جائے
 چاہے رہے کوٹھری میں جا کر دیکھوں گا تو ہسی کہ آخر معاملہ
 کیا ہے۔ ایک ایک قدم آگے بڑھا چوکھٹ پر پہنچا تھا کہ وہی آواز موجود

دل مضبوط کروا لے اندر قدم رکھا۔ دھیرے دھیرے چرپائی تک پہنچا، سر ہانے سے دیا سلانی کی ڈبیا اٹھائی سلگانی چاہتا تھا کہ ڈبیا ہاتھ سے چھٹ گئی، اس وقت مجھے اپنی مصیبت پر رونا آگیا۔ اندھیری کوٹھری میں کھڑا ہوں اور اس اثر دے کی آوازیں جگر کے پار ہوئی جا رہی ہیں۔ ہر دم یہ خیال کہ اب اس نے مجھے کھایا اور اب کھا یا، دیا سلانی کی ڈبیا پیروں میں پڑی ہے۔ ہاتھ ڈالنے کی بہت نہیں پڑتی۔ زبان پر اللہ کا نام ہے۔ ہاتھ پیروں میں لرزہ، قضا سر کھیل ہی ہے۔ بھائی آدمی ساخت نہ آدمی سازم۔ جیسی پڑتی ہے ویسی اٹھاتا ہے، چاروناچار ڈبیا زمین پر سے اٹھائی، دیا سلانی روشن کی، چاروں طرف نظر دوڑائی کچھ دکھائی نہ دیا۔ کونہ کونہ ٹٹولا کہیں اثر دے کا نشان نہ پایا۔ اب ذرا دل کو ڈھارس ہوئی، آواز کو غور سے سنا تو ایک دیوار میں سے آئی ہوئی معلوم ہوئی۔ بسم اللہ کر اس دیوار کی طرف بڑھا خیال صحیح ثابت ہوا، آواز بے شک اس دیوار ہی میں سے آرہی تھی غور کیا تو معلوم ہوا کہ پڑوسی صاحب خواب خرگوش میں ہیں۔ اور خرنے فرما رہے ہیں۔ دل چاہا کہ اس ناشدنی کو ایسی نیند سلاؤں

کہ پھر کبھی کسی بھلے آدمی کی نیند نہ خراب کر سکے۔ اس پا جی پڑوسی کی جان پر صبر کر پھراوڑھ لپیٹ پڑ رہا۔ سو بچا عجب کم بخت منحوس مقام ہے اہاں خواب و خور تک حرام ہے۔ صبح ہوتے ہی ہمارا سلام ہے۔ اور پھر اگر ادھر کا سُخ کریں تو ہم پر تین حرف۔

ذرا پلک سے پلک جھپکی تھی کہ شور و شغب کی آواز سے پھر آنکھ کھل گئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ایک شور قیامت بپا ہے۔ سو بچا کہیں ڈاکہ پڑا۔ نقب لگی یا کوئی خون کی واردات ہو گئی۔ کلمہ پڑھتا آنکھیں ملتا باہر نکلا۔ دل کہہ سو بھی، تیری بلا سے کچھ بھی ہو، انسانی ہمدردی کا تقاضا کہ خدا معلوم کوئی خدا کا بندہ، بیچارہ مصیبت کا مارا کس آفت میں ہو گا کسی کی جان خطرہ میں ہو گئی۔ کسی کا مال، کسی کی ناموس لٹ رہی ہو گی، چل ان چلتے ہاتھ پیروں سے کسی کا بھلا ہو جائے تو اچھا ہے سب سونے والوں کو دل میں بُرا بھلا کہتا جدھر سے آواز آرہی تھی اس طرف چل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دور پر ایک ٹوٹا سا گھر تھا اس کے باہر لوگوں کا مجمع اور اندر سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں چلی آرہی تھیں عورتیں بھی چلا رہی تھیں، مرد بھی

بنکار رہے تھے۔ اس گروہ میں ایک صاحب قدرے معقول صورت نظر پڑے۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے، یہ لوگ کیوں لڑ رہے ہیں۔ بولے صاحب ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ میں نے کہا، خدا مبارک کرے، شادیاں نہ بچائیں۔ بھڑے بھانڈے بچائیں ستورہ پنچیری کے کڑھاؤ چڑھائیں۔ اس میں لڑائی جھگڑے کی کیا بات فرمایا صاحب کل اس کا عقیقہ ہے، میں نے کہا فہما، عزیز اقربا کو جمع کریں اپنے پرایوں کو بلائیں۔ دلغیں دم کروائیں۔ کلام پاک میں سے نام نکالیں۔ یہ کٹم کٹا کس لئے۔ انہوں نے کہا جناب نام ہی کا تو سارا جھگڑا ہے۔ ہم لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک شخص چلغوزہ کی قطع کا۔ اخروٹ سا سر۔ کشمش سی آنکھیں ہستہ سی ناک۔ منہنی، مردہ مال، برے حال، برے احوال، سوکھا چھوڑا رانچا کچھا، تمام منہ پر نہٹوں کے نشان، ہاتھ ہو لہان، کپڑوں کی دھجیاں اڑی ہوئی اس گھر سے باہر نکلا۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت لڑکے کے والد ہیں۔ میں نے دل میں سوچا عجب قیامت لڑکا ہو گا جس نے پیدا ہوتے ہی یہ غضب ڈلایا۔ ماں باپ میں فساد ڈلویا۔ ہاتا پائی

جوت پیزارتک نوبت آئی۔ سارے گاؤں میں رسوائی، ننگ کٹائی ہوئی۔ میں بطور ہمدردی اس شخص کے پاس گیا اور کہا صاحب یہ کیا ماجرا ہے، بس اتنا پوچھنا تھا کہ وہ بھٹ پڑے۔ وہی مضمون ہوا۔ عہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے جھیڑا ہم کو۔ بولے۔ صاحب میری لگائی بلائے بے درماں ہے۔ آفت ہے۔ مصیبت ہے۔ بیتہ نہیں کنجٹ میں کسی بھتنی کا میل ہے۔ کسی چڑیل پچھل پیری کی اولاد ہے۔ خدا معلوم اس پر کیا خدا کی مارت ذرا سی بات میں آپ سے باہر ہو جاتی ہے۔ دیکھئے تو میرا کیا حال کیا ہے۔ نف ہے مجھ پر جو آج سے میں اس سے کوئی واسطہ رکھوں اس بے ایمان کو ابھی کھڑے کھڑے نکالتا ہوں“ یہ الفاظ منہ سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ اندرون خانہ سے آواز آئی۔ بڑا مکانے والا۔ ارے تجھ کو نکال کر بھوڑوں گی۔ مونڈی کاٹے، دیکھتا رہ تیرا جنازہ نکلے گا یہاں سے مچھتا ہوا۔ لو غضب، اندھیرا یہ مجھے گھر سے نکلے گا، خاک میں ملا دوں تجھے اور تیرے گھر کو۔ بڑا گھروالا نکلا ہے“ آواز کچھ ایسی مہیب تھی کہ میں بھی سہم کر رہ گیا۔ اور اس چلغوزہ

کی قطع کے آدمی سے پوچھا کہ، آخر یہ سارا جھگڑا ہے کس بات پر،
 بولا، صاحب کیا بتاؤں۔ ناحق کی تریا ہٹ کر رہی ہے، اچھا آپ ہی
 بتائے لڑکے کا نام باپ پر ہونا چاہئے یا ماں پر۔ میں کہتا ہوں یہ لڑکا
 ہے، اس کا نام میں اپنے نام پر رکھوں گا۔ لڑکی ہوگی تو تجھے اختیار
 ہے، جو چاہے سو نام رکھ لیجو، اس اوندھی کھوپری نے پا کھنڈ مچا رکھے
 ہیں، کہتی ہے ہونی نہیں جو تیرے نام پر نام ہو جائے۔ میرا لڑکا ہے
 تو ہوتا کون ہے اس کا نام رکھنے والا۔ اتنے میں اندر سے پھر وہی
 بھیانک آواز آئی: "لڑکا میرا ہے۔ میرا ہے۔ میرا ہے۔" دنگے کی
 چوٹ میرا ہے۔ ہزاروں لاکھوں میں میرا ہے۔ تجھے اُتے ڈھائی
 گھڑی کی، تجھے لے جائے نتواں، بڑا لڑکے والا بننا ہے، ارے
 تیری سات پشت میں بھی کسی کے ہاں لڑکا ہوا تھا،" میاں چلے غور
 ہوئے "دیکھی صاحب آپ نے اس کی زبان، ڈھائی ہاتھ کی بے ڈھائی
 ہاتھ کی۔ اس کی باتیں سنتے سنتے میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ بس اب مجھ میں
 برداشت نہیں ہے" میں ان کا ہاتھ پکڑا اس مکان سے ذرا دُور
 لے گیا، کچھ دم دلا سا دیا۔ تسلی تشفی کی سمجھایا۔ میاں ذرا سی بات کا

بتنگڑا بنا کر کونسی عقل مندی ہے، تم ہی اس وقت طرح دے جاؤ۔
 غصہ حرام شے ہے۔ لعنت بھی بھیجو۔ بھوک دو۔ اس وقت اس کی ضد
 ہو جانے دو، ایسا بھی کیا ہے، خدا دوسرا لڑکا دے گا۔ تم اس کا
 جو چاہنا نام رکھ لینا۔ خواہ مخواہ گھر بگڑ جائے گا۔ بہت بگڑ کر بولے،
 صاحب گھر جائے بھنگ کے بھاڑے میں میری جوتی سے بگڑے
 چاہے رہے، لڑکے کا نام تو میرے نام پر ہو گا۔ کیوں صاحب میں
 باپ ہوں میرا تنابھی حق نہیں، ”جب میں نے دیکھا کہ یہ ضد کا پورا
 ہٹ کا پکا۔ مریم پر بلیہم نہیں کسی عنوان ماننا ہی نہیں تو پوچھا ”صاحب
 یہ تو بتائیے۔ جناب کا اسم گرامی بے کیا“ بولے ”صاحب کیا اسم گرامی
 کیا نام نامی۔ بس ایک مصیبت ہے۔ خدا جہنم نصیب کرے، ماں
 باپ کو، بکجختوں نے ایسا نام رکھا ہے کہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ اگر
 اس وقت زندہ ہوتے تو بوٹیاں کاٹ ڈالتا بوٹیاں ”میاں چلغوزہ
 کچھ ایسے تاؤ میں آئے کہ آنکھیں لال ہو گئیں۔ منہ میں جھاگ آگئے میں
 نے مشکل ٹھنڈا کیا۔ کہا، پاگل ہوئے ہو جہنم میں گھر بنا رہے ہو، خدا سے
 ڈرو ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا بھی کیا ہے، مجھے بتاؤ تمہارا کیا نام ہے؟“

وع ہم سے نہ چھپا ظالم ہم یا رہیں یا روں کے، بوئے ”گویم مشکل و
 گرنہ گویم مشکل، آپ پوچھے بغیر تھوڑی مانیں گے۔ صاحب بات
 یہ ہے کہ میرے ماں باپ کے ہاں اولاد جیتی نہیں تھی۔ کئی بچے
 ہوئے اور ہٹ ہٹ گئے۔ جب میں ہوا تو ایک فقیر صاحب
 نے بتایا کہ بچہ کا نام ایسا برا رکھو جو موت کو پسند نہ آئے، شاید اس
 طرح تمہارا بچہ بچ جائے، باوا جان نے سو بیج کر میرا نام ’شر رکھا
 اس سے سب اہمذرت کرتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں میری گھر
 والی کے ماں باپ رہتے تھے، اور ان کے بچے بھی مرمربا تے
 تھے، جب یہ کمبخت ناشدنی پیدا ہوئی تو انہوں نے بھی ہماری
 دیکھا دیکھی اس کا نام ”آفت“ رکھا۔ خدا کا کرنا ہم دونوں کی شادی
 ہو گئی۔ اب ہمارے ہاں خدا نے لڑکا دیا۔ آپ ہی انصاف سے
 بتائیے۔ پہل پلوٹھی کا لڑکا۔ باپ کے نام پر اس کا نام نہ رکھا جائے تو
 ہے نہ بدنامی کی صورت۔ اور وہ نیک بخت کسی صورت راضی
 نہیں ہوتی، اپنی ہٹ پراڑی بیٹی ہے۔ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے
 پر کیا مجال جو وہ ناکہن اپنے کپے سے مل جائے“ یہ سارا واقعہ

سن کر بے ساختہ زبان پر آیا۔ اس خانہ تمام آفتاب است بایاپ
 رشر، ماں، آفت، بیٹا، قیامت، پر ضبط سے کام لیا۔ وماغ پر نور
 دیا کہ ان کی اولاد کے واسطے کیا نام مناسب ہے۔ قسمت کی بات
 خدا کو بات رکھنی تھی، ایسا نام سوچا کہ میں پھڑک اٹھا، بولا۔ لاؤ
 استاد قورمہ کا ہاتھ !۔ قسمیہ اس وقت ایسا نام خیال شریف
 میں آیا ہے کہ سن کر بچہ لے نہیں سہاؤ گے، بولے کیا نام، میں نے
 کہا نام۔ ایسا نام کہ تم بھی خوش تمہاری گھر والی بھی خوش۔ پرویسے
 ہی تھوڑی بتائیں گے۔ پہلے یاروں کی مٹھی گرم کرواؤ۔ خیر دینا دلانا
 تو ان کو کیا تھا۔ جب بیچارے بہت منت سماجت خوشامد در آمد
 کر چکے تو ہم نے کہا۔ یار تمہارا نام ”شر“ تمہاری بیوی کا آفت ”تمہاری
 اولاد کا نام ”شرافت“۔ سب سننے والے میرا منہ تکنے لگے، اکثر نے قدم
 لئے۔ جھگڑا چکا، قصہ پاک ہوا۔ ان صاحبزادہ کا نام شرافت قرار
 پایا۔ سو بھائیو یہ نام اس ناچیز کا اختراع کردہ ہے۔

یہ سن کر بزم میں قہقہہ پڑا۔ نووارد صاحب جو بے چین سے
 ہو رہے تھے تاب نہ لاسکے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اہل محفل نے

کہا، تشریف رکھئے، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

ابھی آئے ابھی بیٹھے ابھی دامن سنبھالا ہے

تمہاری جاؤں جاؤں نے ہمارا دم نکالا ہے

دم کے دم تو ٹھہیرئیے، ذرا تو دم لیجئے، پروہ ان دم دلا سول
میں آنے والے نہ تھے، اُن کے دم پر بنی تھی۔ جوتیاں لے یہ جا
وہ جا۔ رع ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا۔

آؤ نواب ضیاؤ الدین خاں والی لوہارو کے ہاں چلیں،
پھکڑوں کی محفل دیکھ لی، اب شرفا کی بزم ایک نظر دیکھیں۔

رئیس کی محفل ہے۔ سر تاجدار کا دربار۔ خود عالم ہے، اور
علماء کا پرستار۔ ثقہ۔ محفل ہے۔ ادب آداب کا خیال۔ حفظ

مراتب کا لحاظ۔ اہل علم اور اہل کمال جمع ہیں

اسد الدخان غالب نواب صاحب کے قریب تشریف

فرما۔ اس خاندان کے ان پر مستعد و احسان ہیں،

نظم و نثر غالب بھی نواب ضیاؤ الدین خاں صاحب کے

پاس رہتی تھی۔ غدر پڑا۔ نظم و نسق دہلی درہم برہم ہو گیا، نواب صاحب

کا کتب خانہ جس کی بابت غالب نے کہا ہے، ”ڈر کر عرض کرتا ہوں بیس ہزار کی مالیت کا ہوگا“ ورق ورق ہو گیا۔ نظم غالب منشر ہوئی، نشر پریشان۔

ایک جانب استاد میر جان تشریف فرما ہیں۔ جزو رسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ہندوستان بھر میں ان سے بڑھ کر کبھو کبھی چوس ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا۔ کوڑی کوڑی پر جان دیتے ہیں، ادھی ادھی جوڑ کر رکھتے ہیں۔ اللہ نے سب کچھ رکھا ہے، پر موٹا جھوٹا کھاتے پھٹا پرانا پہنتے ہیں۔ تھوک لگا لگا کر روپیہ جوڑتے ہیں، لوگ صبح ہی صبح ان کی شکل دیکھنی پسند نہیں کرتے، حتیٰ کہ کسی گھر میں ہمارے منہ ان کا نام بھی نہیں لیا جاتا، مبادا فاقہ پڑ جائے۔ اہل محفل میں سے ایک صاحب نے مسکرا کر استاد سے کہا۔

ایک صاحب۔ کیوں استاد آپ کو روپیہ سے اس قدر انس کیوں ہے۔

استاد۔ صاحب زردی کی زردی دیکھ کر میری آنکھوں میں نور آتا

ہے دل میں سرور آتا ہے۔

ایک صاحب - مانا۔ پھر بھی اس درجہ اس کے درپے ہونا یعنی چہ ؟
استاد - بندہ نواز ایسا کون ہے جو مبلغ علیہ السلام سے مستغنی
ہو اور ان حضرت کے حصول کے درپے نہ ہو۔

ایک صاحب - دُنیا روپے کو دوسرے مقاصد کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اور
جناب نے اس کو اصل مقصد قرار دے رکھا ہے۔

استاد - صاحب آپ کو اچھا کھانے اچھا پہننے میں مزا آتا ہے۔ یہ
ناچیز روپیہ کے ڈھیر دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ جناب کو محفل
رقص و سرود میں لطف آتا ہے، مجھے روپیہ کی چھینکار کا ترنم
بھاتا ہے۔ اپنا اپنا مزا الگ الگ ہے۔ میرا لطف تو غلط
اور جناب کا صحیح یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ آپ کا شوق
مسلم البشوت اور میرا شوق حرفِ غلط، یہ کہاں تک جائز
ہے۔ یہ سلسلہ گفتگو جاری تھا کہ اہل محفل میں سے ایک اور صاحب
بولے، اللہ اس بحث مباحثہ کو ختم کیجئے۔

استاد - واہ میرا صاحب! تبادلہ خیالات میں کیا مضائقہ ہے۔

میر صاحب۔ استاد اسی تبار و نجالات کی بدولت اور آپ کے مولویوں کی کٹ جھتیوں کے سبب اکبر لحد ہو گیا تھا۔

یہ سن کر نواب ضیا الدین خاں صاحب جو تاریخ دانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے چونکے اور بولے۔

نواب صاحب۔ میر صاحب آپ کیا فرماتے ہیں۔ اکبر مسلمان تھا اور مسلمان مرا ہے،

میر صاحب، بندہ نواز! دین الہی قائم کرنے کے باوجود آپ اکبر کو مسلمان کہتے ہیں،

نواب صاحب۔ بیشک دین الہی میں اکبر نے خدائی کا دعوے تو نہیں کیا اپنے کو مجتہد، امام، مجدد بتایا ہے۔ سو اس کی بنا پر آپ اسے خارج از اسلام تو نہیں کر سکتے،

میر صاحب۔ اور وہ خطبہ جو اکبر نے مسجد میں پڑھا ہے۔ اس کی بابت جناب کیا فرماتے ہیں۔

نواب صاحب۔ جی ہاں اس خطبہ پر بڑی لحن طعن ہوئی ہے، جناب کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ خطبہ شروع کن الفاظ سے ہوتا ہے

میر صاحب۔ مجھے الفاظ یاد نہیں آپ فرمائیے۔

نواب صاحب۔ خداوندے کہ مارا خسرو داد، چھٹتے ہی ایک باللاتر ہمتی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کی وحدانیت پر زور دیتا ہے۔ اس کے اکرام کا اظہار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ خطبہ اکبر نے خود نہیں پڑھا۔

میر صاحب۔ خود اس لئے نہیں پڑھا کہ مجمع کا رعب غالب آگیا۔ ہاتھ کا پھینک لگے، زبان نے ساتھ نہ دیا۔

نواب صاحب۔ بجا ارشاد ہوا۔ اکبر پر اور مجلس کا رعب طاری ہو جائے جس کو ہم بارہائیس تیس اور چالیس چالیس ہزار کے جم غفیر کے روبرو تقریر کرتے ہوئے پاتے ہیں، جو میدان جنگ میں مٹھی بھرا آدمیوں کو لیکر بڑے سے بڑے لشکر جبار پر جا پڑتا ہے زور زبان سے ان کی ہمت بڑھاتا ہے، بندہ نواز حقیقت یہ ہے کہ وہ خطبہ ایک لامذہب کا لکھا ہوا تھا، خدا پرست کی زبان اسے پڑھنے سے قاصر تھی۔ اکبر پر مجمع کا رعب نہ تھا رعب تھا اس ذات ذوالجلال اور قوت لایزال کا

جس کی عظمت و شان اس کے دل و دماغ پر تسلط کئے ہوئے تھی اور اس کے خوف سے اکبر لرزہ بر اندام تھا۔ نہ کہ دو چار ہزار کے مجمع کے رعب سے۔ ایک دہریہ کے لکھے ہوئے خطبہ کا وہ حصہ جہاں وہ صراطِ مستقیم کو چھوڑ دیتا ہے ایک دہریہ ہی کی زبان سے پڑھا گیا۔ خدا پرست اور خدا ترس کی زبان سے نہیں۔

میر صاحب۔ بہر حال وہ خطبہ اکبر کی اجازت سے پڑھا گیا اس لئے اکبر مورد الزام ہے۔

نواب صاحب۔ میر صاحب بات یہ ہے کہ اکبر طبع متحسّس لیکر پیدا ہوا تھا۔ ہر معاملہ کی تہ کو پہنچنا چاہتا تھا۔ دربار میں شیعہ سنی اور ہندوؤں کی آپس کی گفتگو نے مباحثہ کی شکل اختیار کر لی۔ ابوالفضل اور فیضی لمحد، لامذہب، شیخ مبارک کی اولاد مولویوں کے زخم خوردہ، مذہب سے متنفر درباریوں و خیل ہوئے، اور ان صحبتوں میں مذاہب کا مذاق اڑانے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر مولویوں کی کج بحثی اور ابوالفضل اور فیضی

کے تیز تیز فقروں کی بدولت راہِ راست سے پھٹک گیا، اور مذہب کا احترام اس کے دل سے کم ہو گیا، اس دور میں اکبر کے اقوال اور افعال میں الحاد اور لامذہبیت کا رنگ جھلکتا ہے، لیکن اس کو مذہب سے جو ایک نسبت ازلی ہے اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی، اور آپ کے بقول لامذہب اکبر ایک مذہب کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں وحدانیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

میر صاحب۔ وحدانیت موجود ہے۔ پر جیو ہتیا کے خلاف احکام جاری کئے جاتے ہیں جن کی بنا پر آج جینی اکبر کو اپنے میں سے بتاتے ہیں۔

نواب صاحب۔ میر صاحب یہ سب اوپری اور سٹری باتیں ہیں جو آپ نے دیکھی ہیں یا سنی ہیں۔ جب غور سے دیکھے تو یہ سب رعایا کو خوش کرنے کا ایک ڈھونگ ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ جیو ہتیا کی مخالفت کرتا ہے۔ اور جنگ اور شکاریں اجازت دیتا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ ضرورتاً۔ تفریحا اور لذت طعام تنوں

کے لئے جیو حقیقا جائز رکھتا ہے۔ اسلام بھی اس سے زیادہ کی کب اجازت دیتا ہے۔ علاوہ ازیں شہر قصبائیوں کی دکانوں سے بھراڑا ہے۔ دن رات کھلے خزانہ مہربازار گوشت فروخت ہو رہا ہے۔ اور اکبر روکتا نہیں۔ بندہ نواز نظر غابت سے دیکھئے تو یہ سب باتیں ہندو رعایا کی دل جوئی کے واسطے تھیں، میر صاحب۔ اچھا یہ سب کچھ تو اکبر ہندو رعایا کی دلجوئی کے واسطے کرتا تھا پر عیسائیت کی طرف میلان کس کو خوش کرنے کو تھا۔

نواب صاحب۔ اکبر مذہب سے خالی الذہن تو کبھی بھی نہ ہوا۔ ایک عرصہ ایسا بیشک گذرا جبکہ وہ کسی خاص مذہب پر قائم نہ تھا۔ اس دور مذہب میں ہر مذہب نے اکبر کو اپنے حلقہ میں لینا چاہا اور خود اکبر نے مذہب کو آلہ کار بنالیا۔

میر صاحب۔ اچھا عیسائیوں سے اکبر کی کونسی غرض اٹکی پڑی تھی۔ جو ادھر ڈھل گیا تھا۔

نواب صاحب۔ اکبر کا ارادہ ہندوستان کے ساحل کو پرتگالیوں کے اثرات سے پاک کرنے کا تھا اور اس کے واسطے بیڑہ کی ضرورت

تھی۔ ہندوستان میں بحری فوج تیار کرنے کی قابلیت کسی میں نہ پائی۔ اس وجہ سے اہل مغرب سے سلسلہ جنبانی کی رع تقریب کچھ تو پہر ملاقات چاہئے، لاسہ یہ دیا کہ عیسائیت کے اصول سمجھنے چاہتے ہیں۔ پادری دہاں سے دوڑ پڑے کہ پھنسنا ہے بڑا شکار۔ سارا قصہ یہ تھا،

میرصنا۔ پر اس وقت کے پادری لکھتے ہیں کہ عیسائیت کی طرف مائل تھا
نوا صاحب۔ بیشک وہ یہ لکھتے ہیں کہ اکبر عیسائیت کی طرف مائل تھا
اور وہ جھوٹ بولنے والے لوگ نہ تھے۔ پر ساتھ کے ساتھ یہ بھی
تو لکھتے ہیں کہ تثلیث کا قائل نہ ہوتا تھا۔ اب فرمائیے۔ میں اگر
یہ کہوں کہ میرصنا صاحب کو میں نے اسلام کی طرف رغبت دلائی
ہے۔ پر وہ دینیت پر اگر بدک جاتے ہیں تو وہ رغبت کس کام کی
ہوئی۔ جب بنیادی اصول نہ مانا۔ جہاں تک اخلاقیات کا
سوال ہے۔ وہ تمام مذاہب میں تقریباً ایک ہی سے ہیں
اعتقادات بیشک جدا گانہ ہیں اور ان ہی کے رو و بدل سے
تبدیل مذہب ہوتی ہے۔ جب تثلیث کا قائل نہ ہوا تو عیسائیت

پر مال کیا ہوا۔ یہ سب ڈھکوسلے تھے اور آخر میں جہانگیر صاف لکھتا ہے کہ اکبر نوبہ کر کے مسلمان مرا ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک چیلے نے جوگن جی سے جھک کر کچھ کہا۔ انہوں نے سر ہلایا اور کہا بے شک اس وقت وہاں رنگے گائے اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بہار ہیوں کی طرف منہ کیا اور کہا آؤ تمہیں ایک میخوار کی صحبت دکھائیں۔ تاجدار مکان ہے۔ سامنے لبریز حوض حوض کے پنج میں فوارہ جام مے کی طرح پھلکا پڑتا ہے۔ گردا گرد تنوار روشنی کی گئی ہے۔ مکان جگمگا رہا ہے۔ آگے پائیں باغ لالہ جام وردست، گلاب گلابی لئے۔ تو نہا لان چمن مست و مخمور جھوم رہے ہیں۔ سبزہ کا منہ چوم رہے ہیں چشم مے خوار ز گس بیمار لڑکھڑا رہی ہے۔ باد بہاری ستانہ دار آ رہی ہے۔

بزم مے ہے۔ جام دینا سبجے ہیں۔ گلہائے خوش رنگ خوشبو کے انبار۔ عطر دان کھلے دہرے ہیں۔ گلاب پاش بھرے رکھے ہیں۔ عود سوز سلگ رہے ہیں، دہواں مستانہ دار اٹھتا ہے اور مینا کا طواف کرتا گدڑ جاتا ہے۔

شمع کے گرد پروانہ، مست مستانہ، سرگشتہ و دیوانہ، آگ سے کھیل رہا ہے۔

آپ آتش کا دو چل رہا ہے۔ شعلہ آشام دو آتشہ اور سہ آتشہ سے دل کی لگی بھج رہے ہیں، کدورت کا یہاں نام نہیں۔ انقباض کا کام نہیں۔

صاف دل پاک درووں جمع ہیں۔ کھل کھیل رہے۔ جن سے دل کھلی ہے، وہی موجود ہیں۔ پہلے ساتی کے نام کی زمین پر گرانی، پھر شغل شروع ہوا۔ جوان سفید رنگ کی پی رہے ہیں۔ سال خوردہ سرخ۔ ساتی تریسم ساق، مزاج داں، طبع شناس گلاب و بید مشک ملا کر لایا ہے۔ حسینان مخمور چشم خدمت کو حاضر۔

مطرب خوش نوا ساز سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ دلی ماتیہ رنگ دیکھ رہی تھیں کہ منجم قدرت تھرا اٹھا۔ آسمان کی طرف نظر ڈالی اور کہا۔

بزم سے ہے نگہ تفرقہ انداز نہ ڈال
اتفاقات سے ہو جاتے ہیں اجاب بہم

جو گن جی نے پوچھا کیا ماجرا ہے۔ جواب دیا۔ فلک کینہ پرور
چشمِ حسد سے دیکھ رہا ہے۔ یہ کوئی دن کا میلہ ہے۔
دلی ماتلے اس بھری پُری محفل کو بہ نظر حسرت دیکھا۔ اور
اٹھ کھڑی ہوئیں۔

چار سبجے ہیں۔ گجرج رہا ہے۔ انجمنِ انجم بے رونق ہو چلی ہے
زہرہ مشرق کی جانب جلوہ گر ہے۔ محفلِ رقص و سرود میں کہر دے
کی تیاری ہے۔ بھیر دیں کی تانیں اڑ رہی ہیں۔ شبِ بیداری کے
آثار اہل محفل کے چہروں سے نمایاں۔ کچھ گسسا رہے ہیں، کچھ جٹ
کو بیٹھے پرتول رہے ہیں۔ اربابِ نشاطِ اجازت چاہ رہے ہیں
محفل کی طرف سے ایک آخری چیز کی فرمائش ہے، یہاں آنکھوں
ہی آنکھوں میں اشارے ہو گئے۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی
بھری محفل میں کہتی ہے نگاہِ مست ساقی کی
کہ یوں گردش میں جام بے خودی انجام پاتا ہے
ادھر یہ حال ہے

ہجومِ عام میں رخسارِ یار کے بوسے مری نظر نے لگا ہیں بچا بچا کے لئے

جو گن جی نٹوں کے کوچہ میں خواجہ امان کی محفل میں آئیں، اس کو بزمِ خموشاں کہتے ہیں۔ اور اس وقت آراستہ ہوتی ہے۔

سلام نہ دعا، آداب نہ بندگی۔ مجہرے نہ کورنش۔ جس کا دل چاہے آئے۔ جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے۔ نہ آنے والے کا خیر مقدم، نہ جانے والے کو خیر باد۔ عجب رنگ کی محفل ہے۔ عجب ڈھنگ کے آداب۔ صدر میں خواجہ صاحب گاؤ تکیہ سے لگے ستار سامنے رکھے ٹھاٹھ جمائے بیٹھے ہیں۔ سامنے صراحی گلاس رکھا ہے نہ تو پر دہ ہے نہ حجاب ہے، ان کا قول ہے، رع خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندوں کی کیا چوری۔ جوڑ بچانے میں دو رو واران کی جوڑ نہیں۔ جوڑی والا قریب دانیاں بانیاں لئے بیٹھا ہے۔ موسیقی والوں میں ان کا ڈنکا بجاتا ہے۔ سُر اس قیامت کا کام کرتے ہیں کہ دوسرا ٹک نہیں سکتا۔ آج ان کے دم سے سُر کا سنگار ہے۔ یہ جب ہوں کہ بین بین کرے گی۔ ستار تار تار گلوں پر بیدہ ہوگا۔ طبلہ دل دلغ دار

لے ستار کے ایک حصہ کو کہتے ہیں۔ ۴۰ ستار کی اصطلاح ہے۔ ۳۰ سُر سنگار ایک قسم کا ساز ہے۔

۴۰ ایک قسم کا ساز ہے۔ ۴۰ ستار کے ایک حصہ کا نام ہے

لئے سینہ کو نبی کرتا پھرے گا۔ اہل محفل زینت وہ محفل ہیں۔ شوقین دھن کے پکے، منہ اندھیرا آن پہنچے۔ میرزا صاحب بھی ایک طرف بیٹھے ہیں، ان کی بابت صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ مرزا کا لے کے استاد ہیں۔ آپ خود سمجھ جائیں گے کہ کس پائے کے استاد ہیں۔

خواجہ صاحب نے ایک جام نوش جان فرمایا۔ اور ستار ملایا صبح کی اذانوں تک یہ محفل برقرار رہی۔ ادھر الد اکبر کی آواز کان میں پڑی۔ ادھر خواجہ امان ستار چھوڑ جام سے منہ موڑا ٹھٹھ کھڑے ہوئے محفل برخاست۔

ولی ماتا دہاں سے سیدھی بلی ماروں اٹلی والی مسجد میں آن پہنچیں دو رکعت نماز فرض قاری فخر الدین کے پیچھے ادا کی۔ اہل دہلی اور اہل ہند کو ان پر فخر ہے، ان کی ٹکڑا قاری بلاد اسلام میں مشکل سے نکلتے گا۔

فرض ادا کر سیدھی ایک اکھاڑے پہنچیں۔ استاد مینڈھ پر بیٹھے داؤں بتا رہے ہیں۔ خلیفہ پٹھوں کو زور کر رہے ہیں جس کے سانس بھر گئے اس نے عشق اللہ کی زمین پر ہاتھ رکھ ڈنڑپیلے لگا۔ استاد کی

سب پر نظر ہے، جو ذرا محنت سے اکسایا اس پر ڈانٹ پڑی، ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں اپنے کام سے کام رکھو جو زور کرتا ہے استاد سے اجازت لیکن جو رد مالی باندھتا ہے ان سے پوچھ کر کسی نے داؤں اوچھا مارا اور استاد خفا ہوئے۔ اگر زیادہ تاؤ آیا تو اٹھ کر ایک چائٹا رسید کیا۔ پھر خود داؤں رواں کر دیا اس میں دس نکتہ بتائے۔ آخر میں تاکید کر دی، اب کے بھولا تو یاد رکھو اٹھ کے دسے ماروں گا۔ نئے پٹھوں کو روم پھرائی جا رہی ہے کہ ان کا بدن ٹوٹے۔ سانس بنے۔ کوئی سی پی سے پسینہ سونت رہا ہے کہیں دو جوان آمنے سامنے کھڑے پاٹے کی بیٹھکیاں لگا رہے ہیں لیجئے وہ مرزا علی جان بیگ اور حاجی جی جوتے ولے اُن پہنچے رد لوں مانے ہوئے استاد میں آج اس فن میں ان کا جواب نہیں۔ ساتھ ساتھ سکھ دیو ہے۔ یہ حضور بہادر شاہ کا پہلوان ہے۔ پیچھے پیچھے صدیق پہلوان بھی اُن پہنچے۔ ان کا خرچ حضرت کالے صاحب اٹھاتے ہیں۔ استاد نے سب کی تعظیم دی۔ حقہ تازہ کر دیا۔ اور اکھاڑے سے ذرا دور بیٹھ کر پینے لگے۔ ایک ایک پٹھے نے اگر گھٹنے پکڑے، ہتھیاں

بھریں۔ مرزا علی جان بیگ اور حاجی جی نے دعائیں دیں۔ ساتھ کے
 ساتھ ہدایتیں بھی ہوتی گئیں۔ کسی کو حکم ہوا تیاری کی بیٹکیاں زیادہ لگایا
 کرو۔ جس کا اوجھ بڑا ہوا دیکھا، کہا بادل پیو۔ دودھ چھوڑ دو۔ کسی کو ارشاد
 ہوا۔ ہاتھ چوڑا کر ڈنڈا پیدا کرو، ایک کو کہا، اوپر اٹھتے وقت گردن
 تکی رہے۔ ذرا پیٹ کی نینس کھیں۔ کسی کو ہٹوں کی ہدایت ہوئی کسی
 کو ڈھیکلیاں لگانے کا حکم کہ بدن اڑنے لگے۔ چھوٹی ٹھوڑیں زور
 کر چکی تھیں۔ اب بڑوں کا منبر آیا۔ خلیفہ سب کو زور کر رہے ہیں
 کسی کی گردن پر گھٹنا رکھ کر سانس بھر دے۔ کسی سے سامنے کے
 زور ہوئے، دو پکڑیں ایسی ہوئیں کہ مرزا آگیا۔ داؤں پھلچھڑیوں کی طرح
 چھٹے۔ پور پور پر داؤں ہوئے۔ بغلی بیٹھے مکر پکڑی۔ ٹنگڑی مار زمین پر
 مے مارا۔ سبب کا زور دیکر پھیلا یا اور گھسے پر کھینچ گیا۔ استاد نے آواز
 دی۔ کندہ سپینہ پر آئے، لڑنختیہ لڑ رہے ہیں۔ کسرتیہ کسرت کر رہے
 ہیں، استماد بیٹھے باتیں بنا رہے ہیں جھگڑا گڑا رہے ہیں۔

لیجے دہ رستم ہند چلے آ رہے ہیں۔ یہ مرد پیل پیکر پیل مست کی
 دُم پکڑ لیتا ہے تو مسکنے نہیں دیتا۔ زمانہ اس کی طاقت کا لوہا مانتا ہے۔

پنج پلواد سے طباقی آہنی کے دوکرویتا ہے۔ دنیا پر اس کی قوت کا
سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ شاہی سکے کے حروف انگلیوں سے مسل کر مٹا
دیتا ہے۔

دلی نے بیتم قدرت سے دریافت کیا کہ ان استادوں اور
پہلوانوں کا کیا حشر ہوگا۔ عرض کی حاجی شرف الدین کا نام مدتوں
قائم رہے گا۔ اپنی یادگار اکھاڑے چھوڑ جائیں گے مرزا علیجان بیگ
کے ساتھ دنیا بڑا داؤں کرے گی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ
رہے گا۔ سکھ دیو کا سکھ دلی آباد کے ساتھ برباد ہو گیا۔ بے فکری
اور پہلوانی کی جُٹ ہے جب یہ لٹ گئی تو وہ بھی اُجڑ گئی۔ صدیق
پہلوان مہاراج الور کی ملازمت کریں گے۔ دلی میں روٹی کے
لاے پڑ جائیں گے، ان کی خوراک ٹھیرے بادام۔ میاں کالے حنا
ان کو مہاراج کی نذر کریں گے، وہاں ان کی پہلوانی فروغ پائے گی
ان کے کارنامے زبان زدِ خلالتی ہوں گے، اور ان کا نام ان کے
بعد بھی زندہ رہے گا۔

اس کارخانہ تکوین و ایجاد میں کون رہا ہے اور کون رہ جائے گا

توقعِ قضا ہی ہے۔ ۵

کیا بھروسہ ہے زندگی کا آدمی بلبل ہے پانی کا

بیماری ایسی بری بلا ہے کہ ہاتھی کو بھی ڈھاوے۔ یہ مردِ پیل انگن
ایسا بچڑے گا کہ تین دن کی بیماری میں آنکھیں چھت سے لگ جائیں گی
میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ پلنگ پر پڑا ہے اور لڑپی پٹی کے نیچے پڑی ہے
کوشش کرتا ہے کہ اٹھائے پر اٹھا نہیں سکتا۔ تِلْكَ الْيَامُ نُدَارُ لَهَا
بَيْنَ النَّاسِ مسکے کے حرفِ مٹا دینے والا دستِ قضا کے ہاتھوں حرفِ
غلط کی طرح مٹا یا جا رہا ہے۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ۔ بڑے سے
بڑے تناور درخت کو ایک جھٹکے میں اکھاڑ پھینکنے والا بادِ فنا کے ایک
جھونکے میں پتہ سا اڑ گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ

دلی ماما تھوڑی دیر ان پہلے پکیر پہلوان کی کشتی دھینکا مشتی
دیکھ چل کھڑی ہوئیں، اور حاجی علیجان پٹوے کی گلی میں ایک مکان پر
ٹھکیں۔ دروازہ پر پردہ پردہ داری کر رہا ہے، یہاں پردہ نشین
خواتین رہتی ہیں۔ مصاحبین محلِ شناس بیرون خانہ ٹھہر گئے دلی ماما
گھر میں تشریف لے گئیں۔ گھر فریہ سلیقہ سے بجا ہر شے طریقے سے رکھی ہے

بال بچے ادھر ادھر کام کاج کرتے پھر رہے ہیں۔ گھر کی بڑی بوڑھی الان میں ایک تخت پر جاننا بچھائے بیٹھی ہیں۔ چہرہ پر ایک دلالت ہے نیکی و پرہیزگاری۔ پاک دامنی و عفت شعاری۔ خدا ترسی و دینداری۔ ع جائمہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود۔ شاگردیں اپنے اپنے سپارہ لئے سامنے سبق یاد کر رہی ہیں۔ محلہ کی ایک بڑھیا میلا برقع سر پر ڈالے تخت کے ایک کونے پر آن بیٹھی، اشارہ سے اپنے پاس بلایا۔ تسبیح ہاتھ سے رکھ پٹاری سر کا پان بنایا۔ گردی کے نیچے سے ایک روپیہ نکال پان کے ساتھ چپکے سے اس کے حوالہ کیا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔

دلی ماتیہ تماشا دیکھ باہر آئیں۔ بھاٹ نے عرض کی کہ دوران غد ہیں اس گھر کی حفاظت جانفشانیوں کے سپاہیوں نے کی۔ محلہ کے غریب غریبا اپنے بال بچوں کو لے ان کے ہاں آن پڑے۔ شہر میں جنس کا حال تھا۔ بازار بند پڑے تھے گھر میں بیٹی کی شادی کے چاول بھرے تھے ابال ابال کہ کھلانے شروع کر دئے۔ ایک روز سوق پامیاں نے بیوی سے پوچھا کہ خاکروب نہ جاروب کش۔ حلال خوری نہ مہترانی۔ اور اشارہ الد محلہ کا محلہ گھر میں بیٹھا ہے۔ صفائی کا کیا انتظام ہوتا ہے بیوی نے

جواب دیا کہ رات کو جب سب سو جاتے ہیں تو میں اور لونڈی یہ کام انجام دیتے ہیں۔ یہ سن کر سب کی زبان پر تقریبت کے کلمے آئے، منجم قدرت نے کہا کہ ان بیوی کی نیکی پٹریوں تک ان کی اولاد کے آگے آئے گی۔ یہ باتیں کرتی ماما جی جتنا کناراہ اپنے کندل میں جا پہنچیں۔ یہاں چاہتی جو گن کے چاہنے والے دیر سے جمع تھے۔ اہل کمال کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ ہر شخص منتظر قدم بوسی نظر کرم کا امیدوار۔ ماما جی نے دربار میں قدم رکھا اور نقیب نے آواز دی۔ باادب۔ ہوشیار۔ نگرہ روبرو۔ سب حسب مراتب ہو بیٹھے۔ دربار جم گیا۔ منجم قدرت کمر خدمت باندھ سامنے آکھڑا ہوا۔ نقیب جبریب اٹھائے سرودہ کھڑے ہیں۔ چیدہ چیدہ صاحب کمال پیش ہو رہے ہیں۔

ایک نوجوان۔ مادرِ روزہرہ جبین ستاروں سے کھیلتا ٹوڑیہ فلک پر سوار دربار میں آیا۔ عطارِ قلمدان لئے جلو میں حاضر نقیب نے آواز دی۔ مرزا عاشور بیگ تشریف لاتے ہیں۔ اپنے وقت کے بہترین منجم۔ انہوں نے برسوں پہلے حکم لگا دیا تھا کہ شہر میں

۱۔ ایک برج فلکی نام ہے۔ ۲۔ ایک ستارہ کو کہتے ہیں جسے دبیر فلک بھی کہا جاتا ہے۔

دہلی پر کوئی آفتِ آسمانی بلائے ناگہانی، آنی مقدر ہے۔ سہ
کانام سن کر اہل محفل پر سناٹا چھا گیا ڈلی ماتاسرنگوں ہو بیٹھیں۔ زخم
جو ابھی بھرے نہ تھے پھر ہرے ہو گئے۔ انگور بھٹ نکلے۔ چشم گریاں
نے دل شوریدہ پر نمک پاشی کی۔ یاد رفتگاں نے تڑپا دیا۔ مرزا صاحب
موصوف میزبان میں ٹانگم ٹوک اترے، دربار میں جگہ پائی۔

میر کرامت علی خاں، شطرنج کے بادشاہ مہروں کی تھیلی ہاتھ میں
لئے۔ حلوہ سوہن کی ٹمکیہ نیفے میں اڑے چلے آ رہے ہیں۔ بھاٹ نے کہا
یار شاطر کرامت علی خاں تشریف لاتے ہیں، ان کی چال کرامت
سے کم نہیں۔ جو شاطر دہلی کا شیخ کرتا ہے، پہلے ان سے بازی ہوتی
ہے۔ دو چار چالوں میں نہج ہو جاتا ہے۔ کشتِ امید پر پانی پھر جاتا ہے
نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ یہ حاضر بھی کھیلتے ہیں غائب بھی۔ بسا طور بار پر جگہ ملی
اتنے میں دریا کی طرف سے کچھ آواز آئی۔ اہل دربار نے مڑ کر دیکھا
تو ایک شخص آستین چڑھائے۔ شرعی پاجامہ پہنے پاؤں اور ہاتھوں سے

لہ ایک برج کا نام ہے۔ لہ ایک مہرہ کا نام ہے۔ لہ ایک شکل کا نام ہے۔

لہ ایک اصطلاح ہے۔ لہ ایک اصطلاح ہے۔

پانی کا ٹاچلا آرہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے کنارہ آیا۔ چشم زدن میں خشکی پر پہنچا
 دریا میں سے آیا اور دامن تر نہ ہوا۔ لوگ تعجب سے دیکھتے تھے۔ نقیب
 نے آواز دی، میرماہی تشریف لاتے ہیں۔ بھاٹ نے عرض کی، فن
 پیرا کی کے استاویے بدل ہیں، دربار شاہی سے میرماہی خطاب پایا
 ہے۔ بہت استادوں سے پانی ہوئے پر اس قلم زم فن نے سب
 کے منہ پھیر دئے۔ دھارے پر چڑھتے ہیں۔ ہندوستان بھر کے
 بیراک ان کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ ماہی و مگر کے زہرے ان سے آب
 آب ہیں۔ بڑے بڑے استاد ان کے روبرو عرقِ ندامت میں غرق ہیں
 ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ یہ کون چار پار چلے آرہے ہیں۔ علم او دب کے
 آثارِ بشرہ سے نمودار۔ ذہانت و کثرت، خوش مذاقی اور تدبیر جلو میں حاضر
 بھاٹ نے آواز دی۔ مولوی محمد شفیع خاں صاحب۔ مولوی محمد تقی خاں
 صاحب مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور۔ عطاء اللہ خاں صاحب
 صدر امین۔ یہ چاروں بھی حضرت عبید اللہ علیہ الرحمۃ کی اولاد ہیں اور
 ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار۔ مولوی محمد شفیع خاں صاحب۔ علم
 منقول ہو رہا میں ان کی سفارش کرتا ہے ان کے حقیقی بھائی مولوی

محمد تقی خاں صاحب علم معقول میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ شہر میں ہزاروں ان کے شاگرد ہیں اور سینکڑوں خوشہ چین۔ مفتی صدر الدین صدر الصدور۔ اپنے وقت کے مفتی۔ عالم بے بدل بیکتائے روزگار مدبر۔ عطاء اللہ خاں صاحب صدر امین ان کو خدائے لایزال نے اپنی بارگاہ کے علم و ادب کا خزانہ عطا کیا ہے۔

بھاٹ تو اتنا کہہ کر خموش ہو گیا۔ منجم قدرت اشارہ پا کر کھڑا ہوا اور یوں عرض پر دانہ۔ دلی سے باہر کچھ عورتیں اور بچے چلے جا رہے ہیں۔ بچے گڈریوں میں لعل ہیں عورتیں آفت رسیدہ شرافت کی تپلیاں، چادروں میں بدن لپیٹے قدم قدم پر لڑکھڑاتی ہیں۔ خاندانی شرم و حیا قدم نہیں اٹھنے دیتی۔ مصیبت آگے دھکیلتی ہے، بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بڑوں نے پیٹ سے پتھر باندھ رکھے ہیں۔ پردہ نشین خواتین جن کا پتہ کبھی کسی نامحرم نے نہ دیکھا سر راہ بیٹھی بچوں کو دودھ پلا رہی ہیں مصیبتوں اور فاقوں نے دودھ سکھا دیا ہے۔ بچہ بچہ جھنجھلا کر منہ مارتا ہے اور آنسو بھری آنکھوں سے مٹر مٹراں کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ فلک زدہ ماں آسمان کی طرف دیکھتی ہے۔ دودھ کہاں جواترے، ہاں آنکھوں سے آنسوؤں کا

دریابہ جاتا ہے، اس قافلہ کا میر قافلہ مولوی محمد شفیع خاں ہے۔ پوتروں کا رئیس، خاندانی نواب، معز الدولہ وزیر ہند کا رشتہ دار۔ یہ اپنے علم و لیاقت کی بدولت سرکار انگریزی میں ایچیٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کا میر منشی ہو گیا تھا جب عذر پڑا اس کے چھوٹے بھائی مولوی محمد تقی نے کہا کہ بھائی صاحب اب شہر میں عزت اور جان کا خطرہ ہے، چلے کہیں نکل چلیں۔ یہ اس زمانہ کے شریف انگریزوں کی آنکھیں دیکھے ہوا تھا۔ راضی نہ ہوا اور کہا کہ انگریز کبھی کسی کو بے قصور نہیں مارتے۔ نہ میں باغی ہوں نہ مجرم، پھر مجھے کیا ڈر۔ چھوٹا بھائی اپنے لواحقین کو لیکر چلا گیا اور یہ یہیں رہے، دوران عذر میں دروازہ پر سے ایک آہ کی آواز آئی، کچھ دہما کا سانس مانی دیا یہ گھبرا کر باہر نکلے دیکھا تو جو ان اکلوتا بیٹا خاک و خون میں لوٹ رہا ہے، کلیجہ دھک سے ہو گیا، دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔

اب آنکھیں کھلیں۔ بیجا اعتبار کا نتیجہ پالیا۔ بڑھاپے کے سہارے کو سپرد خاک کر حرم محترم کو ساتھ لے پانی پت کی طرف روانہ ہوا، اب یہ حضرت قلندر صاحب کے آستانہ پر مع اہل و عیال پناہ لے گا، آفت رسیدوں کا اس وقت اگر کہیں ٹھکانہ ہے تو بزرگوں کے آستانوں،

فقیروں کے تکیوں اور غریبوں کے جھوپڑوں میں امیروں کے محل
 ٹٹ رہے ہیں، رئیسوں کی ریاست پامال ہو رہی ہے۔ اس کا قریبی
 رشتہ دار نواب عمو جان ریاست الوریں برسرِ اقتدار ہے فلک زو
 مفلوک الحال اہل تبار کا حال سن کر پیغامِ وسلام بھیجتا ہے۔ اور ایک
 لٹھ بطور تحفہ۔ اس میں اشرفیاں بھری ہیں، مرغ۔ مردے ازغیب بروں
 آید وکائے بکند۔ کچھ روٹی ٹکڑے کا سہارا ہو جاتا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی
 مولوی محمد تقی حضرت نظام الدین اولیا رحمہ اللہ علیہ کے آستان
 پر بال بچوں کو لئے سر چھپائے پڑھے، ایک کی دوسرے کو خبر نہیں ازندہ
 ہیں پر لاپتہ۔ مردے کو زمین دن روتے ہیں اور پھر صبر کر کے بیٹھ جاتے ہیں
 رونا تو ان کا ہے جو جیتے جی چھٹ گئے، جب تک سانس ہے اُس
 وقت تک آس ہے۔ دونوں بھائی اس امید میں دست بدعا رہیں گے
 کہ شاید کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔ اس کے دربار میں
 دیر سہی اندھیر نہیں۔ یہ پچھڑے پھر ملیں گے محمد شفیع کو بگڑا صاحب کا
 نعم البدل خدا دیگا۔ اس کے ہاں اولاد نہ ہوگی۔ اس کا نام چلے گا۔
 اس کی بیل منڈھے چڑھے گی، یہ دونوں بھائی پھر خوش و غرم یک جا

ہو کر بیٹھیں گے۔

مفتی صدر الصدور کو دیکھ کر منجم قدرت یوں عرض پر داز ہوا کہ
تدبر اور سیاست ان کو ہر محفل میں صدر نشین کرے گی، دورانِ غدر
میں باغی جہاد کے فتوے پر دستخط لینے ان کے پاس جائیں گے۔ وہ
عجب چہ کنم کا وقت ہو گا۔ دستخط کرتے ہیں تو باغی قرار پاتے ہیں۔
حکومت برطانیہ سے بگڑ جاتی ہے۔ اور اگر دستخط کرنے میں ذرا بھی لیت
لعل پاتے ہیں تو باغی سر قلم کرنے کو آمادہ تیغ و تفنگ لے کھڑے ہیں
غرض دو گونہ عذاب است، ان کی رفیق ازلی سیاستِ عملی آرٹے آتی ہے
۔ مخندہ پیشانی دستخط کرتے ہیں۔ نیچے بالجبر لکھتے ہیں ذرا سے نقطے کے
رد و بدل میں سارا معاملہ زیرِ روز بر کر دیتے ہیں۔ باغی شاداں و فرحاں
خوش و خرم فتوے لیکر اپنا راستہ لیتے ہیں۔ غدر کا فتنہ فرو ہوتا ہے۔
یہ باغیوں کی قطار میں عدالت سرکار میں اظہار دیتے ہیں، ان کا دستخط
فتوے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے دستخط پہچانتے ہیں اور عدالت سے
صفائی میں عرض کرتے ہیں کہ یہ دستخط بطیب خاطر نہیں بلکہ بالجبر کئے
گئے ہیں۔ جیسا کہ نیچے تحریر کر دیا ہے۔ بریت ثابت ہوتی ہے۔ صاف

چھٹ جاتے ہیں۔ اہل دربار اس حسن تدبیر پر عیش عیش کرتے ہیں۔ اور ان چاروں کو بھی حسب مرتبت جگہ ملتی ہے۔

نقیب نے آواز دی بدرالدین خاں مہرکن تشریف لاتے ہیں
 لیکن عالم پران کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہے۔ مہر و دام ان
 کے نام ہے۔ زیب دیتا ہے اگر ان کو کہا جائے کہ حج در کف او موم است
 سنگ خارا۔ منجم قدرت نے عرض کی، سلاطین روزگار کی ہر س کھو دیں گے
 دولت میں کھیلے گے۔ صاحب کمال تھے، دربار میں جگہ پائی۔

اسد اللہ خاں غالب تشریف لاتے ہیں۔ مرزا نوشہ لقب۔
 شاہِ مخموری، شہنشاہ مملکتِ تخیل۔ صدر نشین بزمِ شعر و سخن۔ اہل دربار
 نے تعظیم دی، صدر محفل جگہ خالی کی گئی۔

مرزا بیٹھے ہی تھے کہ نقیب نے آواز دی۔ بنشی ہر گوپال تفتہ
 تشریف لاتے ہیں۔ مرزا آگے بڑھے اور کہا۔ کاشانہ دل کے ماہِ ہفتہ
 مرزا تفتہ۔ خوشامد نہیں کرتا۔ سچ کہتا ہوں کہ ان کے کلام کی تحسین
 کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ ۵
 سواد ہند گرفتی بہ نظم خود تفتہ بیا کہ نوبت شیراز وقت تہر زیارت

یہ کہہ ہاتھ پکڑ دصفِ شعر میں لیجا بٹھایا
 منشی بالکنڈ بے صبر جن کا اہل دربار بے صبری سے انتظار
 کر رہے تھے آئے اور مرزا ثقہ کے قریب ہو بیٹھے۔
 نواب مصطفیٰ خاں شیقہ نہ صرف گل بے خار بلکہ گلشن بے خاں
 لئے تشریف لائے، ان کی تنقید سخن کے حضرت غالب شیقہ ہیں
 نوشتم غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکر و اردو میں شیقہ اور فارسی
 میں حسرتی تخلص کرتے ہیں نقیب نے حضرت غالب کے پاس لے جا
 بٹھایا۔

استاد ذوق - ذوقِ سلیم، خاطرِ موشگاف و طبعِ مشکل پسند
 لیکر آئے۔ بھاٹ نے کہا، استادِ شہ تشریف لاتے ہیں۔ اہل دربار نے
 تعظیم دی۔ صدرِ محفل جگہ ملی۔

محمد حسین آزاد، طبعِ آزاد لئے، نیزنگ خیال سے کھیلے، آپ جیات
 بہاتے تشریف لائے، استاد ذوق کے پاس جگہ پائی
 یہ کون جوان ہے! سرخ و سپید رنگ، نازک اندام۔ سیاہ پتلی

لے ذکر گلشن بے خار ان کی تصنیف ہے۔ لے ان کی مشہور تصنیف ہو سہ ان کی تصنیف ہے۔

کالے بال غب غب سیمیں، ماتھے پہ نقشہ۔ ہاتھ میں ستار۔ بھاٹ
 زم زمہ سنج ہوا کہ بلبل بوستان کشمیر۔ طوطی رنگین صغیر مہر کامل بر زنبیر
 سدر صورت موہنی مورت۔ سر مندر کے پجاری پنڈت ہر دے ناتھ ہیں
 مرزا چڑیا اور مرزا کالے کے پاس جگہ پائی۔

قلم سر جھکائے تحریر غلامی لئے آگے آگے۔ خطاطی خط بندگی لئے
 جلو میں حاضر۔ محمد امیر عرف میر پنجہ کش۔ نوک و پلک سے درست نہایت
 نستعلیق ادا سے چلے آ رہے ہیں۔ بھاٹ نے عرض کی یکتائے زمانہ
 خوش خط اور بہترین پنجہ کش۔ ان کے الف میں قد جاناں کا لطف
 ہے اور عین حور عین پر چشمک زنی کرتی ہے۔ ایک حرف ایک روپے
 میں بکتا ہے۔ شام کے وقت کمرہ پر ہو بیٹھے ہیں۔ اور محتاج اضرت
 مند۔ غریب غریبا ایک ایک حرف لے جاتے ہیں اور چوک پر بیچ لیتے
 ہیں۔ بنم نے دفتر مستقبل کھولا اور کہا۔ انجام کار حرم محترم کی حفاظت
 کرتے ہوئے یہ پنجہ کش پنجہ اجل کا شکار ہو گا۔ مزید اشارہ پا کر عرض
 کی۔ ان کے دروازہ پر کچھ گورے آتے ہیں۔ گھر کے اندر گھسنا چاہتے

لے موسیقی کی ایک اصطلاح لے موسیقی کی ایک اصطلاح لے خطاط کی اصطلاح ہے۔

ہیں۔ یہ باہر آتے ہیں تلوار چلاتے ہیں۔ پر ایک کی دوادو، دو کی دوادو چار، دو چار کو تلوار کے گھاٹ اتار ایک گولی کا شکار ہو جاتے ہیں، نقیب نے آواز دی، ماسٹر رام چندر تشریف لاتے ہیں۔ علم ریاضی کے استاد بے بدل منشی ذکا اللہ کے استاد۔ ہندسہ کی ادا کچھ ایسی دل کو بھائی، شکل عروسی نے وہ عروسانہ چھب دکھائی کہ تثلیث کے ہوئے۔ علماء کی صف میں مرتبہ اعلیٰ پر بٹھائے گئے۔

اتنے میں فرید الدین خاں صاحب تشریف لائے بھاٹ نے عرض کی۔ علم ریاضی میں فرد فرید ہیں۔ ماسٹر صاحب کے قریب جگہ پائی۔ ان کے پیچھے پیچھے قطب الدین صاحب تشریف لائے۔ یہ ہندسہ کے قطب الاقطاب ہیں۔ اسی صف میں جگہ پائی۔

تفضل حسین خاں حسن و جمال کی تصویریں لئے۔ قہر و جلال کے مرتع اٹھائے، مردوں کو بیک جنبش قلم زندہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ بھاٹ نے عرض کی، ان کے ہاتھ کی تصویر منہ سے بولتی ہے خط و خال معشوق سا نظر فریب۔ نکتہ میں نکتہ پہاں۔ ان کی رنگ آمیزی لہ اتلیدس کی ایک شکل کا نام ہے۔

سے پیکر تصویر دل میں جگہ پاتا ہے، جہاں مصنوعی حسن حقیقی پر فوقیت لے جاتا ہے۔ اس صاحب کمال کے ردِ برومانی و ہنزاو کارنگ پھیکا پڑا جاتا ہے، رنگ نہیں جمتا۔ چہرہ اتر جاتا ہے۔ منہم نے عرض کی نگار خانہ روزگاریں اپنی یادگار بے شمار مرتعے چھوڑ جائیں گے

ایک شہسوار ابرش بخدئی پر سوار تو موڑ توڑ لنگوری اڑاتا چلا آتا ہے۔ گھوڑے نے قرقری کر رکھی ہے۔ بھاٹ لے لے کہا استاد فوجو بیگ تشریف لاتے ہیں۔ یہ وہی فوجیگ ہیں جنہوں نے لال ڈگی کے ساندھ کو سدھ کیا تھا۔ دلی ماتا نے کہا اچھا یہ وہی فوجیگ ہیں لال ڈگی کا واقعہ بیان کرو، بھاٹ نے عرض کی حضور لال ڈگی پر ایک ساندھ تھا اور آتے جاتے سواروں کو تنگ کرتا تھا، اکثر گھوڑے مار ڈلے سوار زخمی کئے، ایسا ویسا ڈوہر جاتے ہوئے کنیتا تھا۔ ایک دو مرتبہ استاد پر بھی حملہ کیا۔ یہ انٹرمانیج کر نکل گئے۔ زخم خوردہ

لے گھوڑے کا ایک رنگ ہے۔ شہ عرب نسل میں بہترین گھوڑے نجد کے ہوتے ہیں سہ متواتر۔ شہ ایک چال کا نام ہے۔ شہ عرب گھوڑا دم اٹھا کر سوار کی گردن پر سایہ کرتا ہے۔ اس کو قرقری کرنا کہتے ہیں۔

ان کو پہچان گیا۔ اور درپے آزار ہوا۔ ایک روز اسٹاوپا پیادہ اوہر سے چلے جا رہے تھے کہ اس نے دیکھ پایا۔ اور اُن پر ٹھبکا۔ یہ غیب فیض بازار کی نہر میں کود گئے۔ اس نے سینکھ اڑا کر منڈیر کو ریلنا چاہا یہ موقع پا کر کمر پہ چڑھ بیٹھے، ایک ہاتھ بھر کا ڈنڈا ہاتھ میں تھا۔ اب جو مارنا شروع کیا ہے تو اس کو چوکڑی بھلا دی۔ تیور کر بھاگا، انہوں نے ایک ہاتھ سے کوہان پکڑ لیا اور دوسرے سے ڈنڈوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک یہ اس کی سرکوبی کرتے رہے۔ اس کا یہ حال کہ بلبلا تا ہوا اوہر سے اوہر۔ اوہر سے اوہر جاتا ہے۔ آخر کو جب اُسے بالکل ہلکان ہو لہان کر دیا تو دلی دروازہ پر اُس پر سے پھسل پڑے۔ اور اس نے پرلے قلعہ کا رخ کیا۔ اب اسی سانڈھ کا یہ حال ہے کہ دور سے کسی ڈنڈے والے کو آتا دیکھتا ہے تو کان وبا کر بھاگ جاتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن۔ اس نے کسی پر حملہ نہیں کیا۔ دلی ماتانے بیٹھ ٹھونکی۔ چایک سواروں کی صف میں جگہ ملی۔

من صاحب قدغن کے اشقر گھوڑے پر سوار برقعہ چلاتے

لہ تدغن کا گھوڑا ترکی نسل میں بہترین سمجھا جاتا ہے۔ لہ ایک رنگ ہے۔ لہ ایک پال ہے۔

لا رہے ہیں۔ اُن کے پیچھے میاں جان شیام کرن کا ٹھیاواڑی ٹٹو
 پر سوار اُسے پوئیہ لا رہے ہیں۔ بنجم نے کہا غریب الوطنی میں قتل ہوں گے
 ہمارا جچو دان سنگھ والی الور۔ نواب تفضل حسین خاں صاحب کے
 پگڑی بدل بھائی بنیں گے۔ یہ دلی کے اکثر مفلوک الحال اہل کمال کو
 ریاست میں سفارش کر کے روٹی کے ٹکڑے سے لگا دیں گے۔ مومن
 صاحب اور میاں جان چابک سواروں میں جگہ پائیں گے۔ تیرہ بجتی
 وہاں بھی ہم رکاب جائے گی۔ راجہ کے بھائی بھتیجے شورش کریں گے،
 اور یہ وطن سے دور مارے جائیں گے۔ استاد فوج بیگ کے پاس جگہ پائی
 منشی نرائن داس صاحب پنواڑی تشریف لاتے ہیں۔ بھاٹ
 نے عرض کی۔ ص۔ برگ سبزا ست سٹخندہ ورویش۔ بلی ماروں میں پانوں
 کی دکان ہے۔ سہ تشرپ چاتے ہیں۔ اس کتاب کے نکتے ان سے بہتر
 سمجھنے والا روئے زمین پر نہیں۔ شاگرد دکان پر جمع رہتے ہیں۔ درس
 تدریس کا سلسلہ جاری، پان بناتے جاتے ہیں علم کا دریا بہاتے جاتے
 ہیں۔ سرخ رو ہوئے۔ اہل علم میں جگہ پائی۔

ملہ ایک رنگ ہے۔ شہ ایک چال ہے۔

اہل دربار مودب کھڑے ہو گئے۔ دلی ماما نے تعظیم دی۔ یہ
 بن تین بھائی آ رہے ہیں کہ ملار اعلیٰ طبقات نور لئے ساتھ ساتھ ہیں
 تیب نے آواز دی مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مترجم کلام پاک
 ولانا شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر فتح العزیز کے مولف مولانا شاہ
 فیج الدین صاحب۔ بھاٹ نے عرض کی مع خاموشی درشنائے تو
 درشنائے تست، رفعت علم تالب فرش لینے آئی۔ صفِ علما میں
 رتبہ بلند پر لے جا بٹھایا۔

مولوی میاں تذیر حسین صاحب اپنے معتقدین کے ہمراہ دفاتر
 ادبیت مقدسہ لئے تشریف لائے، درجہ اعلیٰ پر صبد ادب بٹھائے گئے
 شاہ اسماعیل صاحب صراط المستقیم کی تلقین فرماتے تشریف
 لے۔ اہل دربار نے تعظیم دی، دلی ماما نے بنظر غایت دیکھا۔ اور کہا
 رہ پور شہادت پر تو فگن ہے، ان کا مستقبل بتاؤ۔ منعم قدرت نے
 ل ماما کی پیشین گوئی کی شہادت دی۔ اور کہا حکومتِ برطانیہ کے
 اہل علم جہاد بلند کریں گے اور سرحد کے قریب لڑتے ہوئے شہید

ہوں گے۔ اہل دربار نے آنکھیں فرش راہ کر دیں۔ اور ہاتھوں ہاتھ مرتبہ ارفع و اعلیٰ پر لیجا بٹھایا۔

فلکِ فتنہ ساز، عیار چالباز واقعاتِ عیاری سکر چشمِ رشک
سے روئے زمین کو دیکھ رہا ہے۔ تو سن زبان کو شیدانِ داستان
میں دوڑاتے میر کا نظم علی داستان گو تشریف لاتے ہیں، طوطی
زنگین بیاں ببل ہزار داستان ہیں۔ مقراضِ زبان گل کترتی ہے
بزمِ آراستہ کرتے ہیں تو بزمِ پرویز کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ رزم
کا اہتمام کرتے ہیں تو کمانِ رستم نقابِ سحابِ عنبریں نقابِ منہ پر
لیتی ہے۔ شیروں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ ابھی ابھی دسترخوان چہا
خوان فرعون کو بے نمک کر دیا۔ محفلِ رنگ و بو آراستہ کی، صراحی و پیمانہ
لا دہرا، ساقی گل عذار کو لا کھڑا کیا، دنیا کو بن پے متوالا بنا دیا۔ جادو
کا ذکر چھیڑا۔ الدرے جادو بیانی سامعین کو دم کے دم میں مسخر کر لیا

۱۔ داستان کے ایک حصہ کو میدان کہتے ہیں ۲۔ قوس و قزح۔

اور پھر لطف یہ کہ دل گھبرانے نہیں پاتا، طبیعت اکتاتی نہیں۔ صاحب کمال تھے، اہل دربار میں داخل ہوئے۔

خسر و خاور، باختر، میں سر بسجود آیا۔ زینت المساجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اور مولانا شاہ عید القادر صاحب نے اجازت چاہی دلی ماتانے دربار پر خاست کیا اور چل کھڑی ہوئیں۔ مہرتاباں آغوش مغرب میں ہے۔ نیر جہاں افروز دیو سیاہ سے بغلگیر معشوقوں کی آمد آمد ہے۔ عشاق گوش بر آواز بیٹھے ہیں۔ کمرہ کی چاندنی بد لوانی گئی کوئی ماہ رو آنے والا ہے۔ جام دینا سبجے ہیں کسی مخمور حشم کا غیر مقدم ہے معشوق گل اندام غنچہ دہن کے لئے پھولوں کی سیجیں سبجی ہیں، مرقعہائے زنگار رنگ سے کمرہ نگار خانہ چین بنا ہے۔ لعبت چینی کی آمد ہے۔ بوتلموں قندیلوں اور قہقروں سے گھر بھرے ہوئے ہو رہا ہے۔ کسی دلبر رنگین ادا کے رخ روشن کی دید کا سامان ہے۔ ساقی سیم ساق و معشوق سیم غب غب کے واسطے چاندی کے ورق لگا کر بیڑے بنائے گئے ہیں۔ سرخ زونی کی تمنا ہے۔ شیشہ آلات کی آرایش سے گھر آئینہ خانہ بنا ہے۔ کسی آئینہ زانو کا انتظار ہے، ڈیوڑھی پر

ڈولی کی آہٹ ہوئی۔ صاحب خانہ خود لپکے۔ پردہ الٹ، ہاتھ پکڑ باہر نکالا کرہ میں لایا بٹھایا کہا روں کو انعام و اکرام دے رخصت کیا۔ غنچہ دل کھل گیا، مراد برائی۔ کہیں عین انتظار میں پیغام بر آیا کہا نہیں آسکے۔ مجبوری ہے، دل مرجھا کر رہ گیا۔ کشت امید پر پانی پھر گیا۔

دلی ماما جامع مسجد پہنچیں۔ شوقین مزاج انگرکھے کے بندوں میں چمپا کے پھول باندھے۔ چوگوشیا۔ دوپٹڑی۔ دو باکی۔ مغلی ٹوپیاں اور شہب، ادہم، مشکلی۔ ابلق گھوڑوں پر سوار دو گامہ۔ سہ گامہ راہوار چلے جا رہے ہیں ارباب نشاط رنگارنگ پوشاکیں پہنے ٹانگ ٹانگ رکھے بیلوں کے ٹانگوں میں مشغول سیر ہیں۔ ٹانگوں کی جھم جھم دل عاشق کو گدگداتی ہے۔ سامنے سے بی داراں صاحبہ کی سواری گزری تیکھی چتون، بانگی ادا۔ اک نگہ فتنہ ساز ڈالتی گز گئیں۔ دلی ماما نے پوچھا یہ کون تھیں۔ مصاحبین میں سے ایک نے عرض کی حضور ان کا دلدارہ نام ہے۔ عام طور پر بی داراں صاحب کے نام سے مشہور ہیں، کرات کی ان پر نظر کرم ہے۔ نازول میں جاگیر ہے۔ شاہ جی کے چھتہ میں لہ بہادر شاہ کو کہتے تھے۔

ذاتی مکان۔ یہاں جب آتی ہیں اسی میں ملتی ہیں، حافظہ قیامت کا پایا ہے، ایک مرتبہ شعر سن لینا شرط ہے۔ پھر کیا مجال جو بھول جائیں۔ جب فرمایش کیجئے حاضر ہے، گلے بازی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، کرامات کا تمام کلام نوب زبان ہے۔

یہ سب خراں خراں باتیں کرتے شاہ جی کے چھتہ پر جا پہنچے دلی مانا نے کہا آؤ ذرا بنی داراں صاحب کے ہاں چلیں۔ دودھ کا جلا چھا چھ کو بھونک بھونک کر پیتا ہے۔ ایک دفعہ کے زخم خوردہ تھے۔ کسی نے چوں تک نہ کی۔ چپ چاپ کان دبائے پیچھے ہو لئے دروازہ پر دستک دی۔ نوکر آیا۔ اطلاع کروائی۔ بنی داراں صاحبہ خود پیشوائی کو آئیں۔ سب کو ایک پر تکلف کمرہ میں لے گئیں۔ جو گن جی کو صدر میں مسند پر بٹھایا۔ چھو کری سے پاندان منگوا اپنے ہاتھ سے پان لگا چاندی کے خالص دان میں پہلے دلی مانا کو پیش کئے۔ چکنی لالچی لکھنؤ کا قوام۔ بنارس کا زردہ اہل محفل نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق گنگا جہنی تنہالی میں سے لیا۔ گلوڑی منہ میں رکھتے ہی دماغ معطر ہو گیا، کتے میں مشک و زعفران

کی آمیزش تھی۔ چھالیا گلاب میں بھگی ہوئی۔ سچی سبب پھونک کر چونا بنایا ہے۔ پان کچھ ایسا رچا کہ دُرِ دندان یا قوتِ مین اور لعلِ احمر کو مات کرنے لگے۔ اتنے میں ایک چھو کری عطر دان لیکر آئی۔ اس میں موسم کے لحاظ سے عطر بھرے تھے۔ اہل محض کو پیش کیا۔ کسی دُرِ دریائے لطافت نے موتیا کا عطر لگایا۔ کسی گل خوردہ نے گلاب بسایا۔ ایک نازک مزاج چھیل چھیلے نے جوئی چنبیلی سے شوق کیا۔ دلی ماما نے عطر گل ملا اور کہا جع خاک سے رغبت رہے جانا ہے آخر خاک میں۔

سب آرام سے گاؤں کیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ پہلے تو کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر موسیقی کا ذکر چھڑ گیا۔ دلی ماما نے بی داراں صاحبہ سے کہا۔

دلی ماما۔ کیوں بی داراں صاحبہ تمہاری موسیقی کی بابت کیا رائے ہے۔
بی داراں۔ بھلا حضور میں آپ کے سامنے کیا رائے دے سکتی ہوں۔
دلی ماما۔ نہیں بی داراں صاحبہ تم اس علم سے واقف ہو۔ تمہاری رائے ہزاروں لاکھوں میں قابلِ وقت ہے۔

بی داراں۔ پابندی حکم کے طور پر اپنے ناقص خیال کا اظہار کئے دیتی ہوں۔
 ساز و دروں سے چھیڑ چھاڑ کا نام موسیقی ہے۔ یہ اظہارِ جذبات
 کا ایک طریقہ ہے۔ مطرب اگر طرب زائہیں تو مطرب نہیں
 موسیقی یا اشک اور یا رقص اور۔ ورنہ موسیقی کہلانے کی مستحق
 نہیں، خالی سُروں کا اتار چڑھاؤ ایک بے معنی چیز ہے نفسِ عا
 جذبات کو متحرک کرنا ہے۔ ہر وہ شے جو جذباتِ انسانی سے
 متعلق ہے۔ حدودِ قواعد کی تحمل نہیں ہو سکتی، اسی طرح موسیقی
 ایک حد تک پابندِ قواعد ہو سکتی ہے۔ زیادہ نہیں۔ تالِ مُر کی
 احتیاط نوآموزوں کے واسطے ضروری ہے ورنہ اصل موسیقی
 ان سب سے بالاتر ہے۔ موسیقی کا مدار مُر پر ہے اور مُر بغیرِ رس
 کے قالبِ بے روح جذباتِ انسانی کو مدِ نظر رکھ کر یہ رس قائم
 کئے گئے ہیں مثلاً شانتِ رس۔ روحانی سکون پیدا کرتا ہے۔
 اور اکثر عبادت سے متعلق چیزیں اسی رس سے بندھی ہیں،
 دوسرا پیرِ رس۔ یہ جذباتِ تہور کو متحرک کرتا ہے اور رُخِ جز کی
 قسم کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ پردِکِ رس، اس میں آہ ہے

ورد بھرا ہے چوتھے شرنکار رس۔ یہ حیوانی جذبات کو برا لگیتے کرتا ہے
 علاوہ ازیں اکثر رس ایسے ہیں جو موسیقی میں عیب گنے جاتے ہیں
 مثلاً غصّہ مشرقی موسیقی کی بنیاد عبادت پر ہے۔ اور وہاں اس
 جذبہ کی گنجائش نہیں۔ فی زمانہ اکثر گانے والے بعینہ ایسا معلوم
 ہوتا ہے کہ سُروں سے سر پھٹول کر رہے ہیں۔ یہ چیز خارج
 از موسیقی ہے۔

تال کو زیادہ اہمیت دینا بھی غلطی ہے۔ راگ کو ایک شعر سمجھ لیجئے
 کہ سُراس کے الفاظ ہیں۔ رس معنی۔ اور تال وزن۔ راگ سے
 رس کو علیحدہ کر دیجئے تو اس کی حقیقت ایک ہل شعر سے زیادہ
 نہیں رہتی کہ الفاظ موجود ہیں۔ وزن صحیح ہے لیکن معنی ندارد
 بس جو رتبہ ایک بے معنی شعر کا ہے وہ ہی بے رس راگ کا، وزن
 ایک حد تک ضروری ہے پر اس کو معنی پر فوقیت نہیں دیا جاسکتی
 اسی طرح تال لازمی ہے مگر اس کو رس پر تفوق نہیں

بی داراں۔ یہ کہکشموش ہو گئیں اور دلی ماتا نے بھی ان کی رائے
 پر مہر تصدیق لگائی اور کہا۔

دلی ماتا۔ بے شک راگ کی روح رواں رس ہے، اگر وہ نہیں تو راگ
ایک جسدِ بے جان ہے، اچھا بی داراں یہ تو بتاؤ کہ طوائفوں
کا پیشہ شروع کب سے ہوا۔

بی داراں۔ حضور بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ اکثر لوگ اپنی لڑکیوں
کو پُرن کر کے مندروں میں بھیج دیتے تھے، اُن کو وہاں باقاعدہ
گائے اور ناچنے کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ رقص و سرود سے دیوتاؤں
کا دل بہلا سکیں اور عبادت میں حصہ لے سکیں ان میں سے اکثر
تو اپنے ایمان پر قائم رہتی تھیں۔ اور تمام عمر مندروں کی خدمت
میں گزار دیتی تھیں اور بعض آخر انسان تھیں دنیا داری کی طرف
مائل ہو جاتیں۔ ایسیوں کو مندر سے مردود کر کے نکال دیا جاتا
تھا۔ ان کا نہ کوئی سر دھرا ہوتا تھا نہ گھرنہ در، چونکہ دیوتاؤں
کے نام کی ہوتی تھیں۔ اس لئے کوئی بیوی بنانے کی بھی ہمت
نہ کرتا تھا اور نہ سماج ہی اجازت دیتا تھا۔ حضور پٹ سب کے
ساتھ لگا ہوا ہے اس دوزخ کو بھرنا ہی پڑتا ہے۔ جب یہ
بد نصیب لڑکیاں تمام دروازہ بند پاتی تھیں تو مجبور و لاچار

اس فن کو جو مندر میں دیوتاؤں کی دلہستگی کے واسطے سیکھا تھا
 انسانوں کی تفریح طبع کے لئے استعمال کرنے لگتی تھیں ،
 جب عمر ڈھل جاتی تو اور بھٹکی ہوئی لڑکیوں کو اپنا آلہ کار بنا
 لے تیں ۔ اور خود ناکہ بن جاتی تھیں ۔ ناکہ اب بڑے معنی میں
 استعمال ہونے لگا ہے ، ورنہ اصل میں یہ ناکہ کی موٹ
 ہے ۔ اور چونکہ یہ عورتیں موسیقی کی ماہر ہوتی تھیں ۔ اس وجہ
 سے ناکہ کہلاتی تھیں ۔ سو حضور اس طرح یہ سلسلہ شروع
 ہوا جو آج تک چلا آتا ہے ، رفتہ رفتہ ہمارے گھرا میروں ،
 رئیسوں کی تفریح گاہ بن گئے ۔ دنیا میں جس طرح شکلیں مختلف
 ہیں اسی طرح طبیعتیں بھی سب نے الگ الگ پائی ہیں ، کوئی
 موسیقی کا شوقین آتا ہے ۔ کوئی حسن پرست اور کوئی بوا لہوس
 ہمارا کام ٹھیرا کہ ہر طرح سے آپ کی تفریح کا سامان کریں ، آپ
 کو معلوم ہی ہے کہ ڈیرہ دار طوائفیں یا کسی رئیس کی پابند ہوتی
 ہیں یا آپس میں لکاح ہو جاتے ہیں ۔ پھر یہ تدبیر کی گئی کہ چھو کر یا
 خریدی جائیں جو امراء کی ہر طرح خدمت کریں ۔ اور ان کی طبیعت

یہاں سے اچٹے نہ پائے ،
 دلی ماتا۔ یہاں ایسی کون سی کشش ہے جو مردوں کو کھینچنے لے چلی
 آتی ہے ، ان کو یہاں کیا ملتا ہے جس سے وہ گھر میں تشنہ رہتے
 ہیں ، اور جس کی تلاش میں در در پھرتے ہیں ،

بی دارا۔ حضور انسان فطرتاً متلون مزاج ہے ۔ علاوہ ازیں یہاں
 ان کو وہ چیز ملتی ہے جو گھر میں مل ہی نہیں سکتی ۔

دلی ماتا۔ یہ ہی تو ہم سمجھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسی کون سی شے ہے ۔
 جو یہاں موجود ہے ۔ اور گھر میں مفقود ۔

بی دارا۔ حضور گھر کی عفت مآب بیوی میں اور ایک طوائف میں بہت
 بڑا فرق ہے ۔

دلی ماتا۔ وہ فرق کیا ہے

بی دارا۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں ۔

دلی ماتا۔ بی دارا ہمارے خاطر سے ۔ دیکھو ہم آج آئے ہی اس نیت
 سے ہیں کہ یہ سب باتیں تم سے سمجھ کر جائیں ۔ اگر ہماری خاطر

منظور ہے تو بتا دو ۔

بی دار۔ بہت اچھا حضور۔ جو حکم الامرفوق الادب، آپ کا خیال ہے کہ عورتیں عورتیں سب برابر۔ طوائفوں میں ایسے کیا لعل لگے ہیں کہ مرد گھر کا آرام چھوڑ کر ان کے ہاں جاتے ہیں، پیسہ خرچ کرتے ہیں، بدنامی مول لیتے ہیں حضور دنیا کا بہوقوف سے بہوقوف انسان بھی بلا وجہ ایک کوڑی خرچ نہیں کرتا کچھ نہ کچھ لیتا ہے۔ جب جیب سے پیسہ دیتا ہے، یہاں جو رئیس اگر لاکھوں اٹھاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ایسی لذت پاتے ہیں جس کی تلاش میں واعظوں کے وعظ، ماں باپ کی تنبیہ ہم نشینوں میں بدنامی کے باوجود کچھ چلے آتے ہیں حضور گھر کی بیوی اور طوائف میں وہ ہی فرق ہے جو شربت کے پیالہ اور شراب کے گلاس میں ہے۔ بیوی شربت کا پیالہ ہے اور طوائف جامِ نئے۔ بیوی سے پیاس بجھتی ہے تفریح نہیں ہوتی۔ طوائف سے پیاس بھی بجھتی ہے تفریح بھی ہوتی ہے اور ساتھ کے ساتھ نشہ بھی۔ یہ ستم قاتل ہے۔ مگر نہایت خوش گوار۔ اب اس کو خواہ مدارعیش و نشاط سمجھئے یا وجہ ممات۔ یہ نشہ ہے جو مردوں کو

کشاں کشاں ہمارے درپر لاتا ہے۔ طوائف آپ کو دار فتمہ و بخور
 کر دیتی ہے۔ آپ اپنی حقیقت کو بھول جاتے ہیں، وہ آپ
 کی ہستی کو ایک عرصہ کے لئے اپنے میں مدغم کر لیتی ہے۔ کوئی
 غم آپ کے پاس آنے نہیں پاتا، آپ دنیا و مافیہا سے قطعاً
 بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ ایک طوائف کے پاس آپ لذتِ فنا
 سے آشنا ہوتے ہیں، گھر میں آپ کی ہستی بدرجہ اتم موجود
 ہوتی ہے۔ یہاں آپ کی خودی بے خودی سے بدل جاتی
 ہے۔ ہم آپ کو اپنا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کی ہو رہتی ہیں
 اس لئے آپ ان کی قدر نہیں کرتے، آپ کی طبیعت ان سے
 چھک جاتی ہے۔ اور وہ دیویاں گھر کی مرغی دال برابر ہو کر
 رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنے کو مکمل طور پر آپ کے حوالہ کر دیتی ہیں،
 ہم آپ کو ترساتے ہیں، اس وجہ سے آپ ہمارے درپے
 ہوتے ہیں اور ان سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں، وہ
 آپ کی آسائش کی فکر میں رہتی ہیں۔ ہم آپ کے لئے سامان
 عیش مہیا کرتے ہیں، ان کو جو کچھ فطرت نے سکھا دیا۔ وہی

جانتی ہیں ہم اس کوفن کی حیثیت سے حاصل کرتے ہیں، وہ خود رو پھول ہیں۔ ہم کو عیش و نشاط کے پانی سے سینچا گیا ہے یہ فرق ہے گھر کی بیوی اور طوائف میں اور یہی چیز ہے جس کے مرد گرویدہ ہیں۔ علاوہ ازیں مرد کی خصوصیت ہے کہ جو چیز اسے بلا مشقت مل جائے اس کی قدر نہیں کرتا اور جسے محنت سے حاصل کرے یا طاقت سے شکار، اسے فخریہ دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ مثلاً آپ ایک مرغ بازار سے خرید لاتے ہیں۔ اس پر کوئی ناز نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اپنا شکار کردہ باعث فخر و نازش ہوتا ہے۔ فی زمانہ بیویاں آپ لوگوں کو بغیر کسی دقت کے مل جاتی ہیں، باں باپ نے بات چیت کی سارا انتظام کیا، آپ عین دن کے دن دو ٹھابن کر چلے گئے، قاضی نے خطبہ پڑھا، آپ نے ایجاب و قبول کیا لیجے صاحب، ہلدی لگی نہ پھٹکری بیوی مل گئی۔ اس وجہ سے آپ ان کی قدر نہیں کرتے، ہمارے دس گاہک ہوتے ہیں، ان سے آپ کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے، ہماری مملکت دل کی تسخیر کے لئے آپ کو تمام

وزرائے استعمال کرنے ہوتے ہیں اور جب ہم قابو میں آجاتے ہیں تو آپ کے دل پر ایک جذبہ فتح کا رفرما ہوتا ہے اور ہم پر ناز کرتے ہیں۔

دلی ماتا۔ بی داراں صاحب بات تو یہی ہے۔ جو چیز بلا محنت مل جائے انسان اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور مرد کی یہ خصوصیت ہے کہ محنت سے حاصل کرنے کے بعد بھی جب پوری طرح قابو پا جاتا ہے تو عدد سے زیادہ بے اعتنائی برتا ہے جس طرح چڑی مار جب تک چڑیا کو پھانسی نہیں لیتا جال پھیلانے والے ڈالے بیٹھا رہتا ہے اور ہزار قسم کے لالے دیتا ہے۔ چریا پھنسی اور گردن پکڑ تھیلے میں ڈال۔ پھر دانہ پانی کی بھی خبر نہیں لیتا۔ مرد ملاقات اسی وقت تک کرتا ہے جب تک قابو نہیں پاتا۔ بعد میں بات بھی نہیں پوچھتا۔ یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ ایک مصاحب نے عرض کی کہ امیر مینائی لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں۔ اور آج نواب احمد سعید خاں صاحب کے ہاں محفل شعر و سخن راستہ ہوگی یہ بات سن جو گن جی اٹھ کھڑی ہوئیں، بی داراں صاحبہ دروازہ

تک چھوڑنے آئیں اور یہ سب شاہ بھولا کے بڑے ہوتے ہوئے
قاسم جان کی گلی کی طرف روانہ ہوئے،

امیر مینائی اس محفل سے آئے تھے۔ جہاں بادۂ عیش و نشاط
کا دور چل رہا تھا۔ ہر طرف سے قفل مینا اور بادہ مستوں کے تہتہوں
کی آوازیں آرہی تھیں۔ اہل طرب وقتِ طرب تھے،
یہاں کی محفل اجر چکی تھی جام و مینا چکنا چور ہو گئے تھے۔ اس
میکہ کے مے آشام تشنہ کام ٹھکانے لگ چکے تھے،

یہ اس باغ کے بیل تھے جہاں دورِ گل کا دور دورہ تھا۔ باؤ
بہاری چل رہی تھی۔ یہاں کاہن لٹ چکا تھا۔ باد تند نے بڑے
بڑے تناور درخت جڑ سے اکھیڑ پھینکے تھے۔ تنخہ گل ٹپڑہ ہو گیا تھا
بیل بے بال و پر نالہ کنان صحنِ جہن چھوڑ چکے تھے۔

بہر صورت امیر مینائی آئے تھے۔ خاطر لازمی تھی۔ دیو سیہ مست
کی دست برد سے جو بھی ٹوٹے پھوٹے ساغر بچے تھے ان کو اکٹھا کر بزم
سخن کی طرح ڈال دی۔

جو گن جی مع اپنے چلیوں کے نواب احمد سعید خاں صاحب کے

دولت کہہ پرہنچیں۔ مغربی وضع قطع کا مکان ہے۔ کوٹھی کہلاتا ہے
اہل فرنگ ہندوستان میں تجارت کی حیثیت سے آئے تھے۔ یہاں پر
مہاجنوں تاجروں اور سیٹھ ساہوکاروں کے مکان جہاں تجارت کا
سلسلہ ہو کوٹھی کہلاتے تھے، بنا بریں فرنگیوں کے مکان بھی کوٹھی
کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ ہر مغربی وضع کا مکان کوٹھی کے نام سے نام
زد ہو گیا۔

نواب احمد سعید خاں صاحب جوگن جی کو دروازہ تک لینے
آئے اور ایک کمرہ میں مرصع مسند پرے جا بٹھایا۔ جوزگار رنگ قالینوں
سے زمین شعر بناتھا، چپہ چپہ پر روشنی۔ سارا گھر تخیل شاعر کی طرح روشن،
یہ سب بیٹھے ہی تھے کہ نوکر نے اطلاع کی، مولانا حالی تشریف
لاتے ہیں، نواب صاحب نے تائب فرش استقبال کیا۔ ان کی
وضع مولویانہ سی تھی۔ سر پر کشمیری کام کی گول ٹوپی، جچی ہوئی، ڈھیلی
ڈھالی اچکن۔ لٹھے کا معمولی موری کا پاجامہ۔ گرگابی جوئی تھججا نکلا ہوا۔
متوسط قد و قامت۔ چہرہ پر کہیں کہیں چپک کے داغ۔ سا تولارنگ،
گول گول چمک دار آنکھیں۔ سب سے دعا سلام کے بعد خوش ہو بیٹھے

اتنے میں نواب کرم الدخاں صاحب المتخلص بہ شیدا۔ اور ان کے چھوٹے بھائی نواب عبدالرحیم خاں صاحب بیدل تشریف لائے اہل محفل نے تعظیم دی۔ مولانا حالی نے ہاتھ پکڑا اپنے پاس بٹھالیا اور نواب احمد سعید خاں صاحب سے کہا ان صورتوں کے مارے دلی میں آپ ہوں رناب یہاں دل نہیں لگتا، اور یہ بھی چار دن کی چاندنی ہے میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔

بخت بہم داستانی شیدا تو نے آخر کو نار سائی کی
میاں بخود تم کہاں چھپے بیٹھے ہو سامنے آؤ۔ ایک پند رہ سولہ
برس کا لڑکا جو حضرت شیدا اور بیدل کے ساتھ آیا تھا اور سُکڑا
سکڑا یا ان بزرگوں کی آڑ میں بیٹھا تھا۔ مولانا کے اصرار پر ورا آگے
سرکا اور دو زانو اٹکھیں نیچی کر ہو بیٹھا۔ مولانا حالی نے پیٹھ پر ہاتھ
رکھا اور کہا طائب صاحب یہ بخود صیبائے شاعری ہے۔ ہم تو
چراغِ سحری ہیں، آئندہ یہ لڑکا چشم و چراغِ سختوری ہوگا، اس کی
روشن خیالی بزمِ سخن کو جگمگا دے گی۔ ہونہار بروے کے چلنے چکنے
پات، ابھی سے کلام میں وہ آب و تاب ہے کہ باید و شاید۔

مشک اُن باشد کہ خود بہوید نہ کہ عطار بگوید اب آپ خود سُن لیجے گا۔
 یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میر مہدی مجروح اُن پہنچے۔ یہ مجروح ناوک
 حسن و عشق ہیں۔ قسام ازل سے دل شوریدہ اور طبع مجروح لیکر
 آئے ہیں۔ گورے چٹے آدمی چھوٹا قد بھاری بدن منہ پر بکثرت چمک
 کے داغ۔ آنکھیں کچھ بد رونق سی۔ اہل محفل کھڑے ہو گئے۔ نواب
 صاحب نے حضرت شیدائے کس پاس بٹھایا۔ شہنشاہ مملکت سخنوری
 صدر نشین بزم شعر و سخن مسلم الثبوت استاد حضرت داغ تشریف
 لاتے ہیں۔ لمبا قد۔ دوہرا بدن۔ کالا رنگ، چڑھی ہوئی ڈاڑھی بھرا
 ہوا چہرہ۔ کھڑا نقشہ۔ آنکھ میں شوخی۔ سر پر چوگوشیا مٹھی ٹوپی۔ مولانا
 عالی کے سامنے ہو بیٹھے۔

پیر معان سخنوری سرشار مینائے شاعری امیر میمنائی
 تشریف لائے۔ اہل محفل نے ہاتھوں ہاتھ لیا صاحب خانہ نے
 صدر میں سند نشین کیا۔

حق اور پان کا دور چل رہا ہے۔ خدام باادب عطر پیش کر
 رہے ہیں۔ رسمی مزاج پر سی کے بعد شعر و سخن کا سلسلہ شروع ہوا ہر ایک

پہلے پڑھنے پر اصرار کر رہا ہے۔

حضرت داغ جیب سے غزل نکال ہو بیٹھے، اور میر مہدی سے کہا اجازت ہے۔ انہوں نے کہا ذرا تو توقف کیجئے ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کیا کہیں جانا ہے۔ اس آخری جملہ پر دُرا زور دیا۔ اور قدرے مسکرائے بھی۔ حضرت داغ نے دست بستہ عرض کی حضور! اب تو اُلٹی لنگاہ بہ رہی ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس آجاتا ہے میں کہاں جاؤں گا۔

مولانا حالی نے پڑہ بینی پر عینک لگائی۔

حضرت شہیدا اور بیڈل نے بھی اپنی اپنی غزل سامنے رکھ لی
میاں بیجو دموقع پا پھر سٹ سٹا تیچھے ہو بیٹھے۔ آخر کار یہ قرار پایا کہ حساب
خانہ جس سے چاہیں پڑھو! میں۔ اب نواب صاحب سخت چہنم
ہیں تھے۔ کس کی بات ٹالیں کس کا حکم مانیں۔ مولانا حالی یہ کیفیت
دیکھ کر بو لے۔ حضرات ہم تو آفتاب سر کوہ ہیں۔ شگون نیک
کے واسطے آج تو شاعر مستقبل میاں وحید الدین بیجو دے شروع کرایا
جائے۔ یہ کہہ کر ادھر ادھر نظر ڈالی۔ پر حضرت بیجو د کہیں نظر نہ پڑے،

پھر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ وہ شیدا اور بتیل کے پیچھے دبے بیٹھے تھے،
 حالی صاحب نے آگے بلایا اور کہا صاحبان یہ نواب کرم الدخاں
 صاحب شیدا کے بھانجے ہیں۔ اس عمر میں بڑے پائے کا شعر
 کہتے ہیں۔ اب آپ سن لیجئے گا۔ یہ کہہ بہنو صد صاحب کو غزل پڑھنے
 کا حکم دیا۔ یہ شرمائے آنکھیں جھوکائے بیٹھے ہیں۔ آہستہ سے
 غزل جیب سے نکال سامنے رکھی اور تحت اللفظ نہایت خوش
 ادائیگی سے پڑھنی شروع کی۔

زندگی سے مجھے نفرت کبھی ایسی تو نہ تھی
 جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی
 مطلع پرواغ صاحب نے زبان کی داد دی اور کہا۔ کیوں
 نہیں آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ میاں بنجو داٹھ کر آداب بجالائے
 اور دوسرا مطلع پیش کیا۔

جاں نثاروں پہ قیامت کبھی ایسی تو نہ تھی
 بے مردت تری عادت کبھی ایسی تو نہ تھی
 تیرے ہی ظلم سے سب کچھ ہے گوارا ورنہ

غم کی جانب مجھے رغبت کبھی ایسی تو نہ تھی
 سچ ہے میں نے ہی تو بدنام کیا ہے تجھ کو
 مجھ سے پہلے تری شہرت کبھی ایسی تو نہ تھی
 اس شعر پر حضرت داغ اچھل پڑے اور کہا، واہ کیا چوٹ
 کی ہے۔ امیر مینائی نے بھی جزاک اللہ کہا مولانا حالی بولے
 داغ صاحب یہ جناب کا رنگ ہے۔
 آج کچھ حال دگرگوں ہے خدا خیر کرے
 تیرے بیمار کو غفلت کبھی ایسی تو نہ تھی
 ذبح ہوتے ترے ہاتھوں سے کسے دیکھا ہے
 جانِ مشتاق شہادت کبھی ایسی تو نہ تھی
 میر مہدی نے کہا خاتم کو چشم زخمِ حوادث سے بچاؤ
 اس کے 'میں بہت سے پہلو پہناں ہیں۔ زندہ باد
 صبح عشرت کبھی آتی نہ ہو پیچھے پیچھے
 مہرباں شامِ مصیبت کبھی ایسی تو نہ تھی
 حضرت داغ نے کہا، لیجئے مولانا مبارک ہو اس جوان نے

میرے ہی رنگ پر چھپا نہیں مارا ہے جناب کا بھی طرزِ ادا
 لے اڑا ہے۔ یہ لفظ مہرباں ملاحظہ ہوئے نہیں آپ کا طرز؟
 تم پر مرکب ہوئی مرنے کی تمنا ہم کو
 خواہش گوشہ تربت کبھی ایسی تو نہ تھی
 سچ بتا کس نے دکھا دی اسے صورت میری
 تیری تصویر کو حیرت کبھی ایسی تو نہ تھی
 امیر مینیائی نے اس شعر کی داد دی اور کہا ماشار الہ کیا بلند
 پروازی ہے۔

کیا کرے گا ستم ایجاد کوئی تازہ ستم
 اب جو ہے مجھ پر عنایت کبھی ایسی تو نہ تھی
 داغ صاحب نے کہا یک نہ شد و شد۔ یہ لیجئے مولانا یہ
 لفظ عنایت بھی جناب ہی پر عنایت ہے واہ میاں جیتے رہو
 کس کی الفت میں ہے یہ حال تمہارا بخود
 بے قراری تمہیں حضرت کبھی ایسی تو نہ تھی^۱
 مقطع پوری طرح ختم نہ ہونے پایا تھا کہ مولانا حالی نے اپنی
 (۱) حاشیہ اٹلے صفحہ پر

غزل شروع کر دی۔ سب منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے
 جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
 دوستوں نے لگانا نہ لگانا ہرگز
 عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
 دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
 زال کی پہلی ہی رسم کو نصیحت یہ تھی
 زد میں تیرے صفِ مژگاں کے نہ جانا ہرگز
 چاہت اک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں
 کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
 ہاتھ ملتے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت
 تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز
 جتنے زمنے تھے ترے ہو گئے ویراں لے عشق
 اے کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

حاشیہ ص ۱۳۳
 اس غزل مطبوعہ نہیں ہے حضرت وحید الدین بخجو صاحب کا ایک مکمل دیوان بارہ سال سے میں
 سال کی عمر تک کا غیر مطبوعہ موجود ہے۔ یہ اس میں سے پڑ ہی تھی۔

کوچ سب کر گئے دلی سے تڑے قدر شناس
 قدر یہاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
 تذکرہ دہلی مرحوم کالے دوست نہ چھیڑ
 نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
 داستان گل کی خزاں میں نہ سنالے بلبل
 ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلا ناہرگز
 ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
 درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
 صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
 کوئی دھچپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
 موزن زن ول میں ہیں یہاں خون کے دریاؤں چشم
 دیکھنا برسے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
 یکے داغ آئے گا سینے پہ بہت لے سیل
 دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں جانا ہرگز
 چپے چپے پہ ہیں یہاں گوہر یکتا تہ خاک

دفن ہو گا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
 مٹ گئے تیرے مٹانیکے نشاں بھی اب تو
 اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
 وہ تو بھولے تھے ہم بھی انھیں بھول گئے
 ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز
 جس کو زخموں سے حوادث کے چھوٹا سمجھیں
 نظر آتا نہیں ایک ایسا گھبراہٹ
 ہم کو گرتوں نے رُلا یا تو رُلا یا اے چرخ
 ہم پہ غیسروں کو تو ظالم نہ ہنسنا ہرگز
 یا خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
 ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
 آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
 بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز
 بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے ائے وزرا
 نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یہاں سے خصت ہو سویرے کہیں عیش و نشاط
 نہیں اس دور میں یہاں تیرا ٹھکانا ہرگز
 کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
 ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
 شاعری مرچ پی اب زندہ نہ ہو گی یارو
 یاد کر کر کے اُسے جی نہ کر دھانا ہرگز
 غالب و شیفتہ و نیر و آرزوہ و ذوق
 اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
 موئن و علوی و صہبائی و منزن کے بعد
 شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
 کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
 ورنہ یہاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز
 داغ و مہر و ح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
 نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
 رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر

اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی

یہاں مناسب نہیں روکے رُلانا ہرگز

مولانا غزل پڑھ ایک طرف ہو بیٹھے، یاد رفتگاں نے اہل محفل کو

تڑپا دیا۔ کوئی دل تھامے بیٹھا تھا، کوئی منہ پھیر کر آنسو پوچھتا تھا، ہر طرف

ایک سناٹا تھا۔ سب سرنگوں، مجروح نے سراٹھایا اور کہا ظالم

زخم ہرے کر دئے

مولانا کے بعد حضرت تبدیل کچھ پڑھنے کو تھے کہ شیدائے روکا

اور خود غزل شریف کر دی۔

کچھ وہ خوفِ خدا نہیں کرتے

حسنِ دالے وفا نہیں کرتے

کرنے والے کہا نہیں کرتے

یہاں کے ڈوبے تر نہیں کرتے

یہ کسی کے ہوا نہیں کرتے

لوگ دنیا میں کیا نہیں کرتے

رحمِ مجھ پر ذرا نہیں کرتے

رکھیں اجاب یہ وصیت یاد

سارے اقرار ان کے جھوٹے ہیں

التفات ان کا بس قیامت ہے

جس کا جی چاہے ان کا ہو جائے

مفتِ شہید کو کرو یا بدنام

مولانا نے کہا 'مبینائی صاحب حضرت شیدا کی زبان کا میں
 شیدا ہوں، الفاظ نہیں کہ ان سہل المتنوع اشعار کی تعریف کر سکوں
 ہاں انہی کے الفاظ میں ان کی تعریف ہو سکتی ہے۔
 کیا پیاری زبان ہے شیدا یہ تو اللہ کی قسم تم ہو
 حضرت پیدل تیار ہی بیٹھے تھے غزل ختم ہوتے ہی انہوں
 نے شروع کر دی

زہے نصیب وہ آیا ہے دلبری کے لئے
 اسی کے واسطے دل جان بھی اسی کے لئے
 اب اس میں صوفی صافی ہو یا کہ واعظ شہر
 ہمیں تو چاہیے ایک شخص دل لگی کے لئے
 نہیں ہے منہ کا نوالہ کچھ آدمی بنتا
 بہت صفات ہیں درکار آدمی کے لئے
 ہر اک اداس ہے دل آویز و دلربا اُس کی
 ہزار دل بھی ہوں تو کم ہیں عاشقی کے لئے
 بچا کے بادہ پرستوں سے ہم نے تھوڑی سی

لگا رکھی ہے فقط دور آخری کے لئے
 اس شعر پر مولانا حالی نے کہا، ہائے بیدل اب تو وہ بھی رہی
 میخانہ کا میخانہ ویران ہو گیا۔ نہ بادہ مست رہے نہ بادہ پرست۔
 دنیا بدل گئی۔

عجبت ہے شکوہ گردوں کہ اس کا لطف و کرم
 کبھی کسی کے لئے ہے کبھی کسی کے لئے
 اس شعر کی بہت داد ملی۔ مولانا اچھل پڑے اور کہا سچ ہے۔
 تِلْكَ الْيَّامُ مَدَّوْا لَهَا بَيْنَ النَّاسِ
 پڑا ہوا ہے عجب پردہ ہم پہ غفلت کا
 یہ اہتمام اور اتنی سی زندگی کے لئے
 جو مجھ سے پوچھئے بیدل تو یہ خراب آباد
 نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

ان کے بعد جناب داغ اور حضرت مجروح میں ضد بحث ہونے
 لگی کہ کون پہلے پڑے، داغ نے کہا کہ حروف تہجی کے لحاظ سے
 میرا حق پہلے ہے، ان کے آگے بیچارے مجروح کی ایک نہ چلی۔

حضرت داغ آگے بڑھے اور مولانا حالی اور امیر مینائی سے اجازت
چاہی دونوں نے کہا بسم اللہ شروع کیجئے۔

غیر ہونا شا د کیوں کیسی کہی

چاہتا ہوں د کیوں کیسی کہی

مطلع چر سب و نحوہ داد ملی۔ امیر مینائی نے کہا واہ کیا میساختگی ہے
پہلے گالی دی سوالِ صل پر

پھر ہوا ارشاد کیوں کیسی کہی

پیر ز ن کے ساتھ بول اٹھی اجل

اس نے اے فریاد کیوں کیسی کہی

تم نے دل کی بات کیوں کیسی کہی

ہم نے یہ ر و د کیوں کیسی کہی

عاشقوں کے قتل پر اتنی خوشی

آپ ہیں جلا د کیوں کیسی کہی

مانگتے تھے میرے ملنے کی دُعا

وہ بھی دن ہیں یاد کیوں کیسی کہی

لیچلیں گے آج تجھ کو ان کے پاس
 لے دل ناشاد کیوں کیسی کہی
 حشر میں پوچھے گا کہ کس گزشت
 یہ کہانی یا د کیوں کیسی کہی
 سن لے وصلِ عدو کے تم نے شعر
 یہ مبارکباد کیوں کیسی کہی
 میں کروں تیری طرح تجھ پر ستم
 لے ستم ایسا د کیوں کیسی کہی
 دل لگایا اب تو ہم نے پسند گو
 ہرچہ بادا باد کیوں کیسی کہی
 صید کر لو طائرِ جانِ رقیب
 تم بنو صیاد کیوں کیسی کہی
 ہم نے تجھ سے آج اپنی آرزو
 بے کئے فریاد کیوں کیسی کہی
 تو بھی لے ناصح کسی پر جان دے

ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی

پہلا مصرعہ پڑھتے ہوئے ذرا آگے سر کے اور گھٹنا ٹیک مولانا حالی
کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا ہاتھ لا۔ انہوں نے سادگی سے ہاتھ میں ہاتھ
دیدیا، ان کا ہاتھ پکڑ دو سر مصرعہ عجب رندانہ انداز سے پڑھا ساری
محفل پھٹک اٹھی،

داغ تجھ کو باغ جنت ہو نصیب

خانماں برباد کیوں کیسی کہی

مقطع پڑھ کر اٹھنے ہی کو تھے کہ امیر مہینائی نے آگے بڑھ ہاتھ پکڑ
پھرو ہیں بٹھا دیا اور کہا داغ صاحب ہم جیسے بیٹا پرستوں کی ادسوں سے
پیاس نہیں بچتی کچھ اور عطا ہو۔ حضرت داغ بات ٹالنے کو مولانا حالی
پر ڈھل پڑے، کہنے لگے، مولانا آپ نے ترک عاشقانہ گوئی کیوں کیا
اب بھی کچھ نہیں گیا ہے ہمارے رنگ میں آجائے مولانا حالی نے جواب دیا
لیل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی

بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی

جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا

ہم نے بھی تیری رام کہا نی چھوڑی
 ان باتوں سے بات نہ ملنی تھی نہ ملی۔ داغ صاحب کو بہر صوت
 ایک اور غزل پڑھنی ہی پڑی،
 آپ جن کو ہدف تیر نظر کرتے ہیں
 رات دن ہائے جگر ہائے جگر کرتے ہیں
 اور کیا داغ کے اشعار اثر کرتے ہیں
 گدگدی دل میں حسینوں کے مگر کرتے ہیں
 غیر کے سامنے یوں ہوتے ہیں شکوے مجھ سے
 دیکھتے ہیں وہ ادھر بات ادھر کرتے ہیں
 دیکھ کر دُور سے درباں نے مجھے للکارا
 نہ کہا یہ کہ ہٹ جاؤ جس کرتے ہیں
 تھک گئے نامہ اعمال کو لکھتے لکھتے
 کیا فرشتوں کا بُرا حال بشر کرتے ہیں
 ابھی غیروں سے اشاروں میں ئی ہیں تہیں
 دیکھتے دیکھتے آپ آنکھوں میں گھر گئے ہیں

درو دیوار سے بھی رشک مجھے آتا ہے
 غور سے جب کسی جانب نظر کرتے ہیں
 ان سے پوچھے جو کوئی خاک میں تے ہیں کہاں
 وہ اشارہ طرف راہ گذر کرتے ہیں
 اک تو نشہ اُس پے نشیلی آنکھیں
 ہوش اُڑتے ہیں جدہر کو وہ نظر کرتے ہیں
 عشق میں صبر و تحمل ہی کیا کرتے ہم
 یہ بھی کجنت کسی وقت ضرر کرتے ہیں
 غیر کے قتل پہ باندھ دیتا ہے فقط
 کھینچ کر اور بھی پتلی وہ مکر کرتے ہیں
 حضرت داغ کو دلی کی ہوا خوب لگی
 رات دن عیش ہے جلسوں میں بسر کرتے ہیں

حضرت داغ کے بعد نواب احمد سعید خاں صاحب طالب نے
 پڑھنے پر اصرار کیا اور اہل محفل نے اجازت دیدی۔ انہوں نے ایک
 غزل پڑھی جس کے آخر میں بسم اللہ مجرباً و مُرسلاً تھا۔ ہر شعر پر ایک

آدھ قدم آگے بڑھ جاتے تھے، اور پھر پیچھے آتے تھے۔ غزل ختم ہو گئی
پر اہل محفل ابھی تشنہ تھے اور ایک اور کے طالب مولانا حالی اور امیر
مینائی کے اصرار پر دوسری غزل شروع کی جس کا مطلع تھا۔

معتوق وہ جو شوخ بھی ہونا نہیں بھی ہو

اور حسن اتفاق سے سب میں حسین بھی ہو

اب مجروح اور امیر مینائی باقی بچے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت
مجروح پہلے عطا فرمائیں۔

انہوں نے کہا حضرات ملاحظہ ہو۔ مطلع غرض کرتا ہوں

اگر ہے بر سر مہر آسماں ہو

کبھی وہ بھی تو ہم پر مہرباں ہو

ملا دیتے یونہیں کچھ ہاں میں ہاں ہو

یہاں ہو پر خدا جانے کہاں ہو

یہ شعر بار بار پڑھوایا گیا۔ مولانا حالی نے جھوم جھوم کر داد دی

تمہارا شکوہ اور میری زباں سے

معاذ اللہ کتنے بدگماں ہو

علاج درِ دل ممکن ہے لیکن
 زباں کو بھی جو یارائے بیاں ہو
 وہ ہے اپنا ہی گلزارِ متنا
 جہاں فصل بہاری میں خزاں ہے
 لکھوں گراںِ اضطرابِ دل کا مضمون
 تو بے قاصد کے خط اپنا رواں ہو
 اس شعر پر امیرِ مینائی نے بہت داد دی اور کہا واہ کیا نازک
 خیالی ہے۔

ہمیں شکوہ ہے اک بیدارِ گر کا
 اب اس میں آپ ہوں یا آسمانِ جو
 تمام اہلِ محفل اس شعر پر لوٹ لوٹ گئے۔ مکرر اور سہ کر پڑھواتے
 تھے۔ مولانا حالی نے کہا۔ مجروح صاحبِ دل چاہتا ہے تمام عمر یہ
 شعر سنتا رہوں، کیا بیان ہے اور کیا زبان۔ یہ خدا وادبات ہے۔
 ع۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔
 نہیں ملتے ہو پھر ہو مطلبِ دل

اگر ہو بے وفا پر میری جاں ہو
 عجب جا ہے جہان عشق بازی
 جہاں نام و نشان جا کر نشان ہو
 یہ بے پر خار خارِ دل سے خوش ہے
 اسی سے تاپناے آشیاں ہو
 ہماری تلخ کامی کو نہ کھو یا
 یونہی کہنے کے تم شیریں زباں ہو
 زمین و آسماں کی برہمی کو
 تمہارا حسن اور میری فغاں ہو
 دل ایسے شوخ پر فن کا ہے طالب
 شرارت جس کے چہرے سے عیاں ہو
 ٹپکتی ہو لگاؤٹ چتوٹوں سے
 جیسا کچھ نیچی نظر میں نہاں ہو
 اس قطعہ پر حضرت داغ نے کہا۔ مجروح صاحب ان باتوں سے رقابت
 ہو جائے گی مجھے بھی ایک ایسے ہی کی تلاش ہے۔ مجروح نے کہا جس

کی طلب صادق ہوگی اس کو مل رہے گا۔ اس میں تکرار کی کیا بات ہے

مجھے مجروح کیا دیر و حرم سے

بے سر ہو اور اس کا آستان ہو

مقطع پڑھ اپنی جگہ پر ہو بیٹھے، اب سب کی نظریں امیر مینائی کی طرف

تھیں۔ انہوں نے جیب سے کاغذ نکالا، عینک لگائی اور اجازت

چاہی۔ مولانا حالی و دیگر شعرا نے کہا عطا ہو،

تصور ایک بحر حسن کا یوں ہے مرے دل میں

رواں رہتا ہے دریا جس طرح آغوش ساحل میں

مطلع چسب دلخواہ داد ملی، داغ نے کہا۔ نئی تشبیہ ہے بڑی کاوش

کے بعد حاصل ہونی ہوگی۔

ہولے زلف جاناں نے نہ چھوڑا مر کے بھی تھچھا

قیامت میں بھی ہم جکڑے ہوئے آئے سلاسل میں

شرابِ سرخ شیشے میں نہیں بے یارے ساتی

بھرا ہے خونِ بسمل یہ گلوے مرغِ بسمل میں

یہ شعر حضرت مجروح نے کئی بار پڑھوایا اور بہت داد دی۔

تمنائے شہادت میں نہ مر کر بھی ہونی راحت
 تڑپ کر خلد سے پھر آ رہا میں کوئے قاتل میں
 ترا خالِ ذقن دیکھا تو ہم کو یہ خیال آیا
 فرشتوں کی جگہ ہے قیدِ زہرہ چاہِ بابل میں
 کیا جوہر مجھے جس دم نکھر کر روبرو آیا
 بجائے تیغِ آئینہ ہے لازم دستِ قاتل میں
 رہِ صحرائے ہستی کو یہ اتسانی سے کاٹے گا
 تری تلوار کا دم اگیا ہے تیرے بسمل میں
 جگہ تربت ہی کی تھوڑی لمبے بعد فنا ہم کو
 فلک میرا بھی حق ہے کچھ زمینِ کوئے قاتل میں
 یہ کس کی نرک مڑگاں کا تصور آنے والا ہے
 کھٹک جاتا ہے اک کاٹا سا جوہر دمِ مے ل میں
 نکالے رنگِ گوجاہل نہیں پر قابلِ صحبت
 طلب ہوتا ہے کب طاؤسِ بہرِ قصِ محفل میں
 تڑپتے ہیں کہ شوقِ قتل میں یہ رقص کرتے ہیں

تماشا بملوں کا ہو رہا ہے کوئے قاتل میں
 یہ کیوں گھبرا رہے ہیں کچھ سبب اس کا نہیں کھلتا
 کبھی جاتے ہیں آنکھوں میں کبھی آتے ہیں وہ دل میں
 چھری کو تیرے اے صبا داب تک بے قرار رہی ہے
 کوئی رگ رہ گئی ہے کیا گلوئے مرغِ بل میں
 تقاضا جاں نثاری کا یہ ہے ایذا نہو اس کو
 خوشی سے کاٹ کر سر اپنا رکھ دیں دستِ قاتل میں
 ہزاروں قیس مشرب ساتھ پھرتے ہیں بیباں میں
 مرے دل میں خیالِ یارِ یالیلے ہے محل میں
 کبھی غمزدہ اگر تیغِ نگہ کو روک لیتا ہے
 تو لپکوں کے چھب جاتے ہیں وہ نشتر مرے دل میں
 جہاں ظلمت تھی میرے گھر شبِ فرقت سمٹ آئی
 دھوئیں کا نام اب باقی نہیں ہے چاہِ بابل میں
 بمشکل ضعف میں پہنچا ہوں میدانِ شہادت تک
 جانے لے قدم اے درو پہلو، کوئے قاتل میں

عروسِ مرگ تیری تیغ کا منہ چوم لیتی ہے
 نکلتی ہے لگا کر حجب یہ غوطہ خونِ سبل میں
 نکل جائے ترا تیرا اکے پہلو سے یہ کیا ممکن
 ابھی اے ترک اتنی جان باقی ہے مرے لیں
 اس شعر پر بہت داد ملی۔

امیر اب تک نہیں کھلتے جو اس کی تیغ کے جوہر
 توقف کیوں ہے کیا مہدی لگی ہو دستِ قاتل میں
 مقطع پڑھنے کے بعد اسی ردیف قافیہ میں دوسری غزل شروع کی
 کسی زہرہ شمائل کا تصور ہے مرے لیں
 منجم یا قمر کا ہے گزرِ خورشیدِ منزل میں
 قدمِ رجبہ تو فرماؤ کوئی رہنے نہ پائے گا
 نکل جائیں گی جتنی آرزوئیں ہیں مے دل میں
 اس شعر پر حضرت داغ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور کہا واہ!
 کیا خوب فرمایا ہے۔ امیر مینائی آداب سجا لائے اور کہا جناب
 کی درۂ نوازی ہے۔

رچے گی خوب اے قاتل غضب کا رنگ لائے گی
 مگائی ہے جو ہندی پیس اس کو خونِ بسمل میں
 نہیں کرتا کبھی پرولے جنت لے گلِ خوبی
 نہایت پائی ہم نے بے نیازی تیرے سائل میں
 یہی حیرت کا عالم ہے تو نظارہ کہاں مجھوں
 نکل بھی آئے محل سے تو پھر سیلی ہے محل میں
 دونی اٹھ جائے تو جھگڑا کہاں شیخ و برہن کا
 بت آئیں سجدے کرتے شوق سے اس کعبہ دل میں
 تڑپتا ہے دل صیاد بھی اس کے تڑپنے پر
 قیامت کا اثر ہے اضطرابِ مرغِ بسمل میں
 یہ بیماری محبت کی کوئی نیرنگ ہے اے دل
 جہاں آیا سیاح اور دونا ہو گیا دل میں
 وہاں زخم نے کس کس منے سے اس کو چوسا ہے
 لب شیریں کی لذت ہے زبانِ تیغ قاتل میں
 جدا ہوتی نہیں گردن سے قاتل زور کرتا ہے

زبان تنجے لذت یہ پانی خونِ بسمل میں
 ذرا محفل سے ہٹ کر خاک اڑا اوجے ادبِ مجنون
 خیال اتنا تو کرنا چاہیے ہے کون محفل میں
 کرامت ہے کوئی ساقی کہ تیری چشمِ میگون ہے
 چھکایا ایک پیالے سے تو نے سب کو محفل میں
 لگا کر وار اوچھا پھر نہ دیکھا اُس طرف تم نے
 قضا روتی رہی بھی ہوئی پہلوئے بسمل میں
 اجازت چاہتی ہے کس سے پروانوں کے آنے کی
 کھڑی ہے عرضِ یگی کی طرح جو شمع محفل میں
 نہ آمادہ ہوا ہو کوئی عمرہ اس کا شوخی پر
 الہی خیرِ جہلی جسی چمکتی ہے مرے دل میں
 امیر اُس کی تجلی گاہ ہے دنیا جو آنکھیں ہوں
 وہی گل ہے گلستاں میں ہی ہے شمع محفل میں
 غزل کے ختم ہونے پر سب نے پھر داد دی۔ حضرت داغ
 نے کہا ایک مرتبہ وہ آرزوؤں والا شعر پھر فرما دیجئے۔ امیر مینائی نے

کہا بہت خوب اور دوبارہ یہ شعر پڑھا۔
 قدم رنجہ تو فرماؤ کوئی رہنے نہ پائے گا
 نکل جائیں گی جتنی آرزوئیں ہیں مرے دل میں
 دلی ماتا نے ایک مصاحب کی طرف دیکھا اور کہا گل کی صورتیں
 نہیں نظر آتیں، وہ لوگ کہاں گئے، جواب ملا تہ خاک۔ یہ سن
 جو گن جی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سب نے تعظیم دی۔ صاحب خانہ دروازہ
 تک چھوڑنے آئے۔

رات کے دو بجے ہیں۔ ہر سمت سکوتِ مرگ طاری ہے۔
 چشمِ فلک سے شہابِ ثاقب آلسو بن بن کر ٹپک رہے ہیں۔
 دلی ماتا اپنی کٹی میں جا پڑیں۔ ساتھیوں نے بھی اپنے اپنے گھر
 راہ لی۔

سے نام سائیں کا

رفتارِ زمانہ

از خواجہ عبد المجید دہلوی

خواجہ صاحب کی اُن تقاریر کا مجموعہ جو دہلی کے
ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ ہو چکی ہیں۔ دہلی کی
قدیم شکالی زبان میں تہذیبِ جدید کا خاکہ نہایت دلکش
انداز میں کھینچا گیا ہے۔ زبان کا لطف، افسانے کی
دلکشی اور اندازِ بیان کی جاذبیت قابلِ دید ہے۔

قیمت ۴۰

مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنؤ

